بھوتوں کی دُنیا

بھوتوں کی دُنیا

ناروے کی کہانیاں

فرخندہ لودھی

۱۹۷۶

فہرست

پہاڑی جِن ۷

نیک دِل چُڑیل ۵۸

بھُوت کی آنکھ ۷۷

جل دیو ۱۰۷

چھلاوا ۱۲۰

سمندری بھُوت ۱۳۵

پہاڑی جِن

آپ کبھی کِسی جِن سے ملے ہیں؟ نہیں ملے؟ چلیے آپ کی مُلاقات مُلک ناروے کے جِنوں سے کرواتے ہیں۔ ان کے دوستوں اور رشتے داروں کے بارے میں بتاتے ہیں۔ ان جِنوں کے کُچھ رشتے دار انگلستان میں بھی رہتے ہیں اور اگر آپ نے کبھی کِسی پَری، جل پَری، چُڑیل یا بھُتنے کو دیکھا ہو تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ناروے کے جِن کیسے ہوئے ہیں۔

یہ کہانیاں جو آپ ابھی سنیں گے چُڑیلوں، بھُتنوں اور جِنوں کی ہیں اور اتنی پُرانی ہیں جتنا ناروے کا مُلک خُود پُرانا ہے۔ بڑے بُوڑھے صدیوں سے اپنے بچّوں کو یہ کہانیاں سُناتے آئے ہیں۔ جب بچّے بوڑھے ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے بچّوں کو یہی

کہانیاں سُناتے ہیں۔ یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا ہے اور چلتا رہے گا۔

ناروے کے پہاڑی جِن کی یہ کہانی، جو میں آپ کو سُنانے لگی ہوں، میں نے ایک بڑے میاں سے سُنی تھی۔ یہ بڑے میاں بہت بُوڑھے تھے اور زندگی بھر ناروے کے گھنے جنگلوں، بُلند پہاڑوں اور خُوب صُورت وادیوں میں گھومتے رہے تھے۔ ناروے کی وادی کو چاروں طرف سے پہاڑوں نے گھیر رکھا ہے، ان پہاڑوں پر چیڑ اور دیودار کے سرسبز درخت آسمان کی طرف سر اُٹھائے کھڑے ہیں۔ گرمیوں کے موسم میں نرم ہوا اُنھیں یُوں جھُلاتی ہے جیسے لوریاں سُنا رہی ہو۔ ان ہی پہاڑوں سے صاف شفاف پانی کے آبشار گرتے ہیں اور ان کا پانی چھوٹی چھوٹی ندیوں کی صُورت میں بہتا ہوا نیلی جھیلوں میں جا گرتا ہے۔ ان نیلی جھیلوں میں زرد کنول کے پھول تیرتے پھرتے ہیں۔ رُوپہلی مچھلیاں پانی کی سطح کے اُوپر اُڑتے ہوئے مچھروں اور بھُنگوں کو پکڑنے کے لیے ہاتھ ہاتھ بھر اُونچا اُچھلتی ہیں۔ ان کی ڈبکیوں سے پانی کی آئینے جیسی خاموش سطح پر چھوٹے چھوٹے بھنور اور ہلکی ہلکی لہریں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ چیزیں دیکھنے والے کے دل کو لُبھاتی

ہیں۔ اگر کبھی رات کے وقت آپ ناروے کے ساحِلوں کی سیر کرنے نکلیں اور بہُت دُور پہاڑوں کے پیچھے چاند طلُوع ہو رہا ہو تو شاید آپ کی مُلاقات کسی جِن بھوت سے ہو جائے۔

پہاڑی جِن بہت بڑی شے ہوتا ہے۔ جب وہ جنگل میں چلتا ہے تو اُس کا سر چیڑ اور دیودار کے بُلند درختوں سے بھی اُونچا دکھائی دیتا ہے۔ بعض جِنوں کا ایک سر ہوتا ہے اور بعض کے ایک سے زیادہ۔ مثلاً دو بھی ہو سکتے ہیں اور درجن بھر بھی۔ سب سے بڑے جِن کے سر سب سے زیادہ ہوتے ہیں اور وہ باقی جِنوں سے قد میں بھی بڑا، موٹا تازہ اور بھیانک ہوتا ہے۔ وہی ان کا بادشاہ بھی ہوتا ہے۔

پہاڑی جنوں کے سر تو کئی کئی ہوئے ہیں مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ آنکھ اکثر ایک ہی ہوتی ہے اور پیشانی کے بیچ میں لگی ہوتی ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ پہاڑی جِن جب چاہیں اِس آنکھ کو نِکال سکتے ہیں۔ آنکھ میں مٹی یا تنکا وغیرہ پڑ جائے تو وہ جھٹ سے آنکھ نکال کر دھو دھا کر، صاف کر کے پھر سے رکھ لیتے ہیں۔ اس طرح ان کو زیادہ اچھّا نظر آتا ہے۔ پہاڑی جِن عام طور پر بہت بُرے

ہوتے ہیں۔ انسانوں کو تنگ کرتے ہیں، بچّوں کو ڈراتے اور اُنہیں اُٹھا کر لے جاتے ہیں۔

پرانے زمانے میں یہ پہاڑی جِن بڑے آدمیوں کو بھی اُٹھا کر لے جاتے اور اپنے گھروں میں لے جا کر اُن سے طرح طرح کے کام کرواتے۔ بے چارے انسان ان کے گھروں میں جھاڑو لگاتے، صفائی کرتے، فرش وغیرہ دھوتے اور جِن ان پر بے حد ظُلم کیا کرتے۔ مگر خیر، یہ تو پُرانے زمانے کی بات ہے۔

اب زمانہ بدل گیا ہے۔ جِن تو اب بھی ہیں مگر اب یہ انسانوں سے ڈرتے ہیں۔ بڑے سے بڑا جِن بھی انسانوں کی بستیوں کی طرف آنے کی جرأت نہیں کرتا۔ وہ اپنے پہاڑی غاروں میں چھُپے رہتے ہیں۔ پچھلے زمانے میں جِن کسی انسان کو پکڑ کر لے جاتے تو گاؤں کے لوگ کسی نہ کسی طرح اس کو ان ظالموں سے چھُڑا لاتے۔ دیہاتی جانتے تھے کہ اگر گرجے کا گھڑیاں بجاتے ہوئے جائیں تو جِن قریب نہیں پھٹکتے۔ گھڑیاں کی گونج جہاں تک سُنائی دے گی جِن بھُوت، پریت وہاں سے بھاگ جائیں گے۔ گونج خواہ میلوں سے سُنائی دے، جِنوں کو یوں لگتا

ہے جیسے گھڑیال ان کی رُوح کھینچ رہا ہے اور اُنہوں نے قیدی انسان کو نہ چھوڑا تو وہ مر جائیں گے۔ گھڑیال کی گونج سے ڈر کر اکثر جِن قیدی کو چھوڑ دیتے تھے۔ وہ سُورج کی روشنی سے بھی خوف کھاتے تھے۔ جُوں ہی کِسی جِن کی نظر سُورج پر پڑتی، وہ یا تو بھاپ بن کر اُڑ جاتا، یا گِر کر ٹوٹ جاتا اور کِرچی کِرچی ہو کر بکھر جاتا۔ اصل میں جِن، بھُوت، چڑیلیں سب اندھیرے کی اولاد ہیں۔ جوں ہی روشنی آئی، یہ مرے یا ڈر کر بھاگے۔

جِن خُوب صُورت لوگوں کو پکڑ کر بہت خوش ہوتے تھے۔ حسین اور نازوں میں پلی شہزادیاں تو اُنہیں ہمیشہ سے بہُت پسند تھیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ناروے پر ایک رحم دل بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ وہ جتنا نیک دِل تھا، اتنا ہی دُکھی بھی تھا۔ بادشاہ کی خُوب صُورت ملکہ بادشاہ سے بھی زیادہ اُداس رہتی تھی۔ خُدا نے اُنہیں سب کچھ دے رکھا تھا مگر اولاد نہ تھی۔ اُنہیں یہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ جب وہ بُوڑھے ہو جائیں گے تو اُن کا راج پاٹ کون سنبھالے گا۔ رعایا بھی اسی طرح سوچتی تھی، کیوں کہ رعایا کو اپنے بادشاہ

سے بے حد محبّت تھی۔

ایک دن صُبح کے وقت بادشاہ شاہی باغ میں سیر کر رہا تھا، وہ آج بھی اُداس تھا اور کھِلے ہوئے پھولوں کو حسرت سے تک رہا تھا۔ اُسے یہ خیال ستا رہا تھا کہ کاش! اس کے ہاں بھی پھولوں جیسے معصُوم بچّے ہوتے، جو شاہی باغ کی روشوں اور محل کی غُلام گردشوں میں کھیلتے پھرتے۔ محل میں کتنی خاموشی ہے! میں کِس قدر اکیلا ہوں! اچانک ایک بُوڑھا بونا نمودار ہوا۔ اس کی سفید داڑھی اتنی لمبی تھی کہ زمین کو چھُو رہی تھی۔ بادشاہ اس کو دیکھ کر چلتے چلتے رُک گیا۔

بونے نے بادشاہ کو جھُک کر سلام کیا اور کہا: "بادشاہ سلامت، آپ اُداس نہ ہوں۔ اللہ اچھّے دِن لانے والا ہے۔ عن قریب آپ کے ہاں تین خُوب صُورت بیٹیاں پیدا ہوں گی۔ ان کے حُسن کی مثال دنیا بھر میں نہیں ملے گی۔ لیکن عالی جاہ، ایک بات یاد رکھیے، آپ کی کوئی بیٹی اُس وقت تک محل سے باہر پاؤں نہ رکھے جب تک سب سے چھوٹی بیٹی پندرہ برس کی نہ ہو جائے۔ اگر آپ نے اِحتیاط سے کام نہ لیا تو تینوں شہزادیوں کو آندھی اُڑا کر لے جائے گی اور آپ ان کو کبھی

نہ دیکھ سکیں گے، اچھّا، خدا حافظ! میری نصیحت یاد رکھنا۔" یہ کہہ کر بونا غائب ہو گیا۔

بادشاہ حیرت کے عالم میں جہاں کھڑا تھا، وہیں کھڑا رہ گیا۔ وہ بوڑھے بونے کی باتیں سُن کر خوش تو تھا مگر اُسے اپنے کانوں اور آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ بار بار اپنے آپ سے پوچھتا تھا کہ جو کُچھ دیکھا اور سُنا خواب تھا یا حقیقت؟

کچھ دیر بعد بادشاہ ہوش میں آ کر ملکہ کو خوش خبری سُنانے گیا۔ یہ خبر سُن کر ملکہ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔ اُسے بھی اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

بونے کی پیش گوئی سچ ثابت ہوئی۔ قدرت نے بادشاہ کو تین خُوب صُورت بیٹیاں دیں۔ سُونا محل بچّیوں کے قہقہوں اور معصُوم باتوں سے آباد ہو گیا۔ بچّیاں شاہانہ شان و شوکت سے پرورش پا رہی تھیں۔ اُن کی چھوٹی سے چھوٹی خواہش کا خیال رکھا جاتا تھا، مگر بوڑھے بونے کی نصیحت کو بھی بھُلایا نہیں گیا تھا۔

محل کی کھڑکیاں اور دروازے کھلے رہتے تھے، تا کہ دھوپ اور ہوا کمروں کے

اندر آ سکے۔ ہوا اور نرم دھوپ کے ساتھ باغ کی چنچل تتلیاں بھی اندر آ جاتیں جنہیں پکڑنے میں شہزادیوں کو بڑا لطف آتا۔ اُنہیں محل کی چھت کے نیچے ہر قسم کا کھیل کھیلنے کی اجازت تھی، مگر محل سے باہر قدم نکالنا منع تھا کہ کہیں آندھی اُنہیں، اُڑا کر نہ لے جائے۔ محل کے ہر دروازے پر ایک لمبا تڑنگا پہرے دار کھڑا رہتا تاکہ شہزادیاں باہر نہ جا سکیں۔

بہار کے خُوش بُو بھرے دِن تھے۔ شام کا سُہانا سماں تھا۔ چھوٹی شہزادی کی سالگرہ ہونے والی تھی۔ محل کے نوکر چاکر کئی ہفتوں سے تیّاریوں میں مصرُوف ہونے کی وجہ سے تھک کر چور ہو چکے تھے۔ بہار کی مست ہوا نے اُن کے تھکے ہوئے جسموں پر نیند طاری کر دی اور وہ دِن ڈھلنے کے ساتھ ہی گہری نیند سو گئے صرف شہزادیاں اور پہرے دار جاگ رہے تھے۔

شہزادیاں باہر کی دُنیا دیکھنا چاہتی تھیں، ان کا جی چاہتا تھا کہ محل کی چھت کے نیچے سے نِکل کر کھُلی فضا دیکھیں۔ باغ کے راستوں اور روشوں پر درختوں کے گنگا جمنی سایوں میں گھُوم کر لُطف اُٹھائیں۔ تینوں نے آپس میں مشورہ کیا اور

دبے پاؤں اُوپر کی منزل سے اُتر کر نیچے آ گئیں، نیچے پہنچ کر سب سے بڑی شہزادی ماریا نے قریب کھڑے پہرے دار سے کہا:

”آج کا دِن کتنا خُوب صُورت ہے۔ آج آندھی آنے کا ہرگز امکان نہیں۔ کیا خیال ہے، ہم تھوڑی دیر کے لیے باہر جا کر گھُوم پھر آئیں۔ جلد ہی لوٹ آئیں گے۔ ہمیں جانے دیجیے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔“

”نہیں۔ ہرگز نہیں۔“ پہرے دار نے جواب دیا، اور آگے بڑھ کر اُن کا راستہ روک لیا تاکہ شہزادیاں باہر نہ جا سکیں۔

یہاں سے نااُمّید ہو کر تینوں بہنیں اگلے دروازے پر پُہنچیں اور وہاں کھڑے پہرے دار سے بھی باہر جانے کی درخواست کی۔ اب کے منجھلی شہزادی نے بات شروع کی۔ اس کا نام الزبتھ تھا۔ اس نے پہریدار سے کہا:

”مہربانی کر کے ہمیں محل سے باہر جانے دیں۔ آج موسم اچھا ہے۔ آندھی آنے کا ڈر نہیں. ہم بس سُنہری مچھلیوں والے فوّارے تک جائیں گے۔ فوّارہ زیادہ دُور تو نہیں۔ ابھی گئے، ابھی واپس آئے۔“

”نہیں۔۔ ہرگز نہیں۔“ پہرے دار نے جواب دیا۔ وہ جانتا تھا کہ ہر وقت محل میں بند رہنا بہت مشکل ہے۔ بے چاری لڑکیاں اُکتا گئی ہیں۔ باغ کی رونق اُن کو

اپنی طرف کھینچ رہی ہے مگر بادشاہ کے حکم کے بغیر شہزادیوں کو باغ میں جانے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ اس لیے اس نے صاف انکار کر دیا۔

شہزادیاں یہاں سے مایوس ہو کر، برآمدے میں سے ہوتی ہوئی، اس سے اگلے دروازے پر پہنچیں۔ جُوں ہی وہ دروازے کے پاس گئیں، مالی اُن میں پھُولوں کا بڑا سا گُل دستہ لیے ہوئے لپکا۔ وہ ہر روز شہزادیوں کے کمرے میں سجانے کے لیے پھُول لایا کرتا تھا۔ محل کے کھُلے دروازے میں سے باغ کا منظر نظر آتا تھا۔ ہر طرف رنگارنگ پھول کھلے تھے۔ ہوا میں قسم قسم کی خوش بُو بسی ہوئی تھی۔ ننّھی مُنّی چِڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ شہد کی مکھّیوں کی بھِن بھِن، تتلیوں کا ناچ اور بھونروں کی گونج، اس درخت سے اس درخت پر پھُدکتی گلہریاں، اُچھلتے کُودتے خرگوش، بڑی بڑی آنکھوں والے ہرن، جھومتے درخت، جا بجا بہتی شاف شفاف پانی کی نہریں اور نہروں پر جھُکے ہوئے پھُولوں کے گچھّے شہزادیوں کو بُلا رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ سارا باغ اکٹھّا ہو کر انہیں۔ آواز دے رہا ہے۔ آجاؤ! آجاؤ! یہ سب چیزیں تُمھاری راہ دیکھ رہی ہیں۔

سب سے چھوٹی شہزادی جیر دانے پہرے دار سے کہا:

"ہمیں باغ میں جانے دیجیے، آپ کی بڑی مہربانی ہو گئی۔ ہم دو منٹ میں واپس آ جائیں گے۔"

"نہیں۔ مُجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو محل سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

یہ کہہ کر پہرے دار نے دروازہ بند کر دیا۔

شہزادی جیر دا پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔ پہرے دار کے روکھے جواب اور دروازہ بند کر دینے سے اُس کا دِل ٹوٹ گیا۔ وہ جہاں کھڑی تھی، وہیں کھڑی سِسکیاں لے لے کر روتی رہی۔

شہزادی کو روتے دیکھ کر پہرے دار کا دِل پسیج گیا۔ اُس سے شہزادی کے آنسو دیکھے نہ گئے۔ اس نے نرمی سے کہا:

بہت اچھّا۔ اگر آپ وعدہ کریں کہ آپ میری نظروں سے ایک منٹ کے لیے

او جھل نہ ہوں گی تو میں آپ کو تھوڑی دیر کے لیے باغ میں جانے دُوں گا۔“

شہزادیوں نے وعدہ کیا اور پہرے دار نے ڈرتے ڈرتے انہیں باغ میں جانے کی اجازت دے دی۔

تینوں بہنیں، زندگی میں پہلی بار کھُلی فضا میں نکلی تھیں۔ باغ کی نرم گھاس اُن کے پاؤں تلے تھی۔ سروں پر نکھرا ہُوا نیلا آسمان اور چاروں طرف درخت اور پھُولوں کے تختے۔ وہ سر اُٹھا اُٹھا کر میلوں تک پھیلے ہوئے آسمان کو دیکھ رہی تھیں، اِدھر اُدھر گھُوم رہی تھیں اور نئ نئ چیزیں دیکھ کر خُوشی سے ناچ رہی تھیں۔ وہ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتی تھیں اُن کا ہنسی کے مارے بُرا حال تھا۔ وہ اِس سے پہلے کبھی اِتنا خوش نہیں ہوئی تھیں۔ تینوں نے پھُول توڑ توڑ کر اپنی جھولیاں بھر لیں۔ اس عرصے میں وہ تمام وقت پہرے دار کی نظروں کے سامنے رہیں۔ بار بار اُسے بُلا کر تسلّی دے رہی تھیں۔ وہ بھی مُسکرا کر جواب دے رہا تھا۔ جب اُن کی جھولیاں پھُولوں سے بھر گئیں تو بڑی بہن ماریا نے کہا:

”چلو، اب واپس چلیں۔“

عین اسی وقت سب سے چھوٹی شہزادی جیرڈا کی نظر کیاری کے سِرے پر اُگے ہُوئے ایک نہایت خُوب صُورت گُلاب پر پڑی۔ یہ پھُول بہت بڑا اور اِتنا خُوش بُو دار تھا کہ اُس کی خُوش بُو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ شہزادیوں نے ایسا پھُول کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جیرڈا نے حیرت سے پھُول کی طرف اِشارہ کیا۔

"دیکھو آپا، دیکھو۔ اس چھوٹے سے پودے میں کتنا بڑا گلاب لگا ہوا ہے۔ یوں لگتا ہے ٹہنی پر نہیں بس ایسے ہی ہوا میں لٹک رہا ہے۔"

"واہ۔۔۔!" منجھلی بہن الزبتھ نے حیرت سے کہا۔ "اسے تو ہم ضرور توڑیں گے۔ کتنا پیارا ہے!"

تینوں پھُوں توڑنے کے لیے ایک ساتھ بھاگیں۔ اُن کی جھُولیوں میں بھرے ہوئے پھُول راستے میں بکھر گئے۔

اگلے ہی لمحے آسمان سیاہ ہو گیا۔ اِس سے پہلے کہ شہزادیاں پلٹ کر پہرے دار سے کُچھ کہتیں یا واپس آتیں، ہر طرف گھُپ اندھیرا چھا گیا۔ آسمان پر بادل گرجنے لگے، بجلی زور زور سے کڑکنے لگی اور پاؤں کے نیچے زمین اِس طرح کانپنے

لگی جیسے زلزلہ آگیا ہو۔ یہ حالت کوئی ایک منٹ رہی۔ پھر آسمان صاف ہو گیا۔ لگتا تھا جیسے کبھی آندھی یا طوفان آیا ہی نہ ہو۔ پہریدار نے نظر دوڑائی تو شہزادیوں کا نام و نشان تک نہ تھا۔ وہ غائب ہو چُکی تھیں۔ باغ کا کونا کونا چھانا گیا۔ کئی دِن تک شہزادیوں کی تلاش جاری رہی، لیکن شہزادیاں کہیں نہ ملیں۔ بادشاہ اور ملکہ غم سے پاگل ہو گئے۔ وہ زور زور سے شہزادیوں کو پُکارتے تھے:

"ماریا!۔۔۔ الزبتھ!۔۔۔ جیرڈا!۔۔۔ کہاں ہو تم؟"

بادشاہ، جو اب بوڑھا ہو چکا تھا، اس غم کو برداشت نہ کر سکا اور بیمار ہو گیا۔ ملکہ بے چاری کو بیٹیوں کے یوں اچانک غائب ہو جانے کا غم اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ وہ روز بروز کم زور ہوتی جا رہی تھی۔ آخر وہ بھی بستر پر پڑ گئی۔

بادشاہ نے فرمان جاری کیا جس میں کہا گیا تھا کہ جو شخص شہزادیوں کو ڈھونڈ کر محل میں پہنچا دے گا اُس کی شادی اُس شہزادی سے کر دی جائے گی جِس کو وہ پسند کرے گا۔ مُلک اور خزانے کا آدھا حصّہ بھی اُسے انعام کے طور پر دیا جائے گا۔

شہزادیوں کے گُم ہونے کی خبر مُلک کے ہر حصّے میں پھیل گئی۔ سب لوگ شہزادیوں کو ڈھونڈنے نکل پڑے۔ امیر اور غریب، موٹے اور دُبلے، لمبے اور ٹھنگنے، بہادر اور بُزدل، طاقرور اور کمزور سبھی مردوں نے قسمت آزمائی۔ تکلیفیں اُٹھائیں۔ کئی کئی مہینے سفر کرتے رہے، مگر شہزادیوں کا کُچھ اتا پتا نہ ملا۔ اِتنی خبر بھی نہ ملی کہ بادشاہ کی اِن خُوب صُورت اور بھُولی بھالی بچّیوں پر کیا بیتی۔

محل کے پاس ہی ایک غریب بیوہ کا جھونپڑا تھا۔ اُس کا ایک ہی بیٹا تھا، جو دنیا بھر کا کاہل اور نکمّا تھا۔ وہ گرمیوں کے لمبے دِن کِسی باغ میں گھاس پر لیٹ کر خواب دیکھنے میں گزار دیتا۔ چِت لیٹا گھنٹوں نیلے آسمان کی طرف دیکھتا رہتا۔ سردیوں کی لمبی راتیں بستر میں گزارتا اور کتابیں پڑھتا رہتا۔ وہ کوئی کام نہ کرتا اور نہ کِسی چیز میں دِل چسپی لیتا۔ جانتے ہو اُس نکھٹّو کا نام کیا تھا؟ اس کا نام تھا اولیو۔ اولیو کی ماں اپنے بیٹے سے بے حد مایوس تھی۔

شہزادیوں کے گُم ہو جانے کی خبر اولیو تک بھی پہنچی۔ اُس نے بھی بادشاہ کا اِعلان سُنا، وہ اکثر ان نیلی آنکھوں اور سنہری بالوں والی شہزادیوں کے بارے میں سوچا

کرتا تھا۔ ایک روز اس نے ماں سے کہا:

"امّی، آپ میرے سفر کی تیّاری کریں۔ کُچھ کھانا وانا باندھ دیں۔ میں شہزادیوں کو تلاش کرنے جارہا ہوں۔"

ماں کو اولیو کی اس بات پر سخت حیرت ہوئی۔ اس کا بیٹا جو دن بھر بے کار پڑا چارپائی توڑتا رہتا تھا، ایسا مُشکل کام کرنے کے لیے کیسے تیّار ہو گیا؟ اُس نے مزیدار چیزیں پکا کر پوٹلی میں باندھ دیں۔ بیٹے کو گلے لگا کر چُوما اور دُعائیں دے کر رُخصت کیا۔

اولیو نے کھانے کی پوٹلی ڈنڈے کے سِرے پر باندھی اور ڈنڈا کندھے پر رکھ کر نِکل کھڑا ہوا۔ وہ جلدی جلدی قدم اُٹھاتا اُن وادیوں کو پار کر گیا جن کو اچھّی طرح جانتا تھا، اور پھر اُس پہاڑ کے قریب پہنچا جو زیادہ دُور نہ تھا۔ وہ ہولے ہولے اس پہاڑ پر چڑھنے لگا۔ کبھی راستہ گھُوم کر اُوپر چڑھتا اور کبھی گھُوم کر نیچے کسی وادی میں نِکل جاتا۔

اسی طرح چلتے چلتے کئی دِن، کئی ہفتے اور کئی ماہ گُزر گئے۔ بعض اوقات رستہ چلتے

چلتے درختوں والے خاموش اور گھنے جنگلوں میں سے گُزرتا۔ کبھی راستے ہیں بڑے بڑے آبشار اور دریا آتے، کبھی لمبی چوڑی جھیلیں آتیں۔ ان جھیلوں پر جھُکی ہوئی چٹانیں عجیب منظر پیش کرتی تھیں۔ اولیو جھیلوں کے کنارے رُک جاتا اور شفّاف پانی سے مُنہ ہاتھ دُھو کر ہری گھاس پر بیٹھ جاتا، ماں کا دیا ہوا کھانا نِکال کر کھاتا اور صاف سُتھرے پانی سے پیاس بُجھاتا۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد پھر چل پڑتا۔ یہ کھانا کتنے دِن چلتا۔ آخر ختم ہو گیا۔

اب اولیوؔ کسانوں کے مکانوں میں چلا جاتا اور اُن سے دُودھ روٹی لے کر کھالیتا۔ کِسان اس کے ساتھ محبّت اور نرمی سے پیش آتے اور اُس کی ہر طرح مدد کرتے۔

جب انہیں پتا چلتا کہ وہ کھوئی ہوئی شہزادیوں کو ڈھونڈنے جارہا ہے تو وہ اور بھی مہربان ہو جاتے۔ کیونکہ شہزادیوں کے لیے ہر شخص کے دِل میں ہمدردی تھی۔ وہ اولیو کو دُعاؤں کے ساتھ رُخصت کرتے اور کُچھ دِنوں کا کھانا ساتھ کر دیتے۔

ایک دِن چلتے چلتے شام ہوئی تو اولیو نے سوچا کہ اب آگے نہیں جانا چاہیے۔ سامنے، ذرا فاصلے پر ایک ویران سا گھر نظر آیا۔ وہ اُس کی طرف بڑھا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے کوئی آواز نہ آئی، اور نہ کِسی نے دروازہ ہی کھولا۔ اولیو نے زور زور سے آوازیں دیں۔

"کوئی ہے؟ اندر کوئی ہے؟"

کوئی جواب نہ آیا۔ آخر اُس نے دروانے کا کُنڈا کھُولا اور اندر چلا گیا۔ اندر کوئی نہ تھا۔

”بڑی عجیب بات ہے۔“ اولیو نے دِل ہی دِل میں کہا۔ ”نہ معلُوم لوگ کہاں چلے گئے ؟ “

اسی وقت باہر قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ تھوڑی دیر بعد سفید داڑھی والا ایک بُوڑھا اندر داخل ہُوا۔ وہ اِس قدر کمزور اور ضعیف تھا کہ اُس نے دونوں ہاتھوں میں سوٹیاں پکڑ رکھی تھیں جِن کے سہارے وہ مُشکل سے چلتا تھا، بڑے میاں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اولیو سے کہا۔ ”آداب عرض ہے۔ غالباً تُمہارا نام اولیو ہے۔“

”جی ہاں۔ یہی میرا نام ہے۔“ اولیو نے جواب دیا۔ وہ حیران تھا کہ بڑے میاں اُس کا نام کیسے جانتے ہیں۔

پھر بڑے میاں نے درخواست کی :

”میں کچھ دیر یہاں آرام کرلوں ؟ بہت تھک گیا ہوں۔ پیر دُکھ رہے ہیں۔ “

”کیوں نہیں بابا جی۔“ اولیو نے جواب دیا۔ ”لیکن میں تو خود اِس گھر میں اجنبی

ہوں۔"
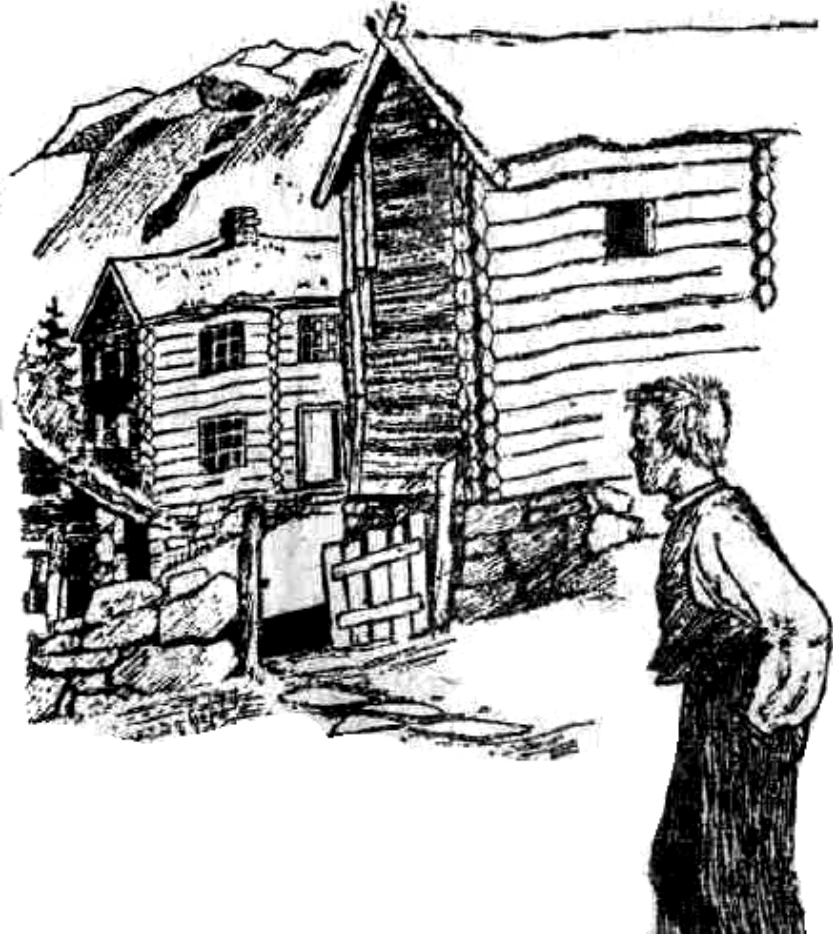
"ہاں میں جانتا ہوں۔ جانتا ہوں۔" بُوڑھے نے ہنس کر جواب دیا اور پھر جیب سے چھوٹا سا پائپ نِکال کر اُس میں تمباکو بھرا۔ پھر ہوا میں اُنگلی لہرائی اور اُنگلی

میں شعلہ بھڑک اُٹھا۔ اس شُعلے سے بڑے میاں نے اپنا پائپ سلگایا۔ اولیو حیران کھڑا تھا۔

پائپ کا لمبا کش لینے کے بعد بڑے میاں نے کھانس کر گلا صاف کیا اور کہا :

"نوجوان، کیا تُم مُجھے ایک روپیہ دے سکتے ہو؟ بڑی بھُوک لگی ہے۔ میری جیب بالکل خالی ہے۔ تھکن اور بھوک نے مُجھے بے حال کر رکھّا ہے۔ اور دیکھو، میں کتنا بوڑھا اور کمزور ہوں۔"

اولیو کو اندازہ ہو چُکا تھا کہ بڑے میاں کی معلُومات عام آدمی سے زیادہ ہیں اور وہ غیب کی باتیں بھی جانتے "وہ تو ٹھیک ہے کہ آپ کی حالت نازک ہے، مگر میرے پاس بھی پیسہ نام کی کوئی چیز نہیں، اور نہ کبھی تھی۔ ہاں، کھانے کے لیے کُچھ تھوڑا بہُت ہے۔ دونوں مِل جُل کر کھالیں گے۔ لیکن بڑے میاں، آپ ایک کام کریں۔ آپ میرے ساتھ لکڑیاں پھاڑیں تا کہ میں آگ جلا کر کھانا گرم کروں۔"

بڑے میاں نے صاف اِنکار کر دیا کہ مُجھے لکڑیاں پھاڑنی آتی ہی نہیں۔ میں نے کبھی ایسا کام نہیں کیا اور نہ سیکھنے کی ضرُورت پیش آئی۔

”چلیے، میں سکھاتا ہُوں۔“ اولیو نے کہا۔ ”آدمی کو ہر کام کرنا چاہیے تا کہ مُشکل کے وقت اپنی مدد آپ کر سکے۔“

یہ کہہ کر اولیو بڑے میاں کو باہر لے آیا جہاں لکڑی کے موٹے موٹے لٹھّے پڑے تھے۔ اولیو نے کُلہاڑی گھُما کر ایک لٹھّے پر ماری اور بڑے میاں سے کہا :

اب آیئے اور دیکھیے کہ کُلہاڑی ٹھیک جگہ لگی ہے؟ اور یہ بھی بتایئے کہ لکڑی چِر بھی گئی ہے یا نہیں؟ ذرا غور سے دیکھیے۔“

بوڑھا لنگڑاتا ہوا آگے بڑھا۔ اُسے آنکھوں سے کم دِکھائی دیتا تھا، اس لیے وہ لٹھّے کے اُوپر جھُک گیا تا کہ اچھّی طرح دیکھ سکے۔ جُوں ہی وہ جھُکا، اُس کی سفید لمبی داڑھی چِری ہوئی لکڑی کے بیچ میں آ گئی۔ اولیو نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ لکڑی کے شگاف میں پھنسی ہوئی کُلہاڑی کھینچ لی۔ لکڑی کا شگاف بند ہو گیا۔ بُوڑھا لاکھ کھینچتا تھا، داڑھی باہر نہ نکلتی تھی۔

”اوہ! اوہ! اوہ!“ بڑے میاں تڑپنے لگے۔ وہ زمین پر پاؤں مار رہے تھے اور غصّے سے چلّا رہے تھے۔

”چھوڑ دو۔۔۔ چھوڑ دو۔۔۔ مُجھے جانے دو۔“

”آپ ضرُور جایئے۔“ اولیو نے کہا۔ ”لیکن ایک شرط پر۔ پہلے مُجھے یہ بتایئے کہ

تینوں شہزادیوں پر کیا گُزری اور وہ کہاں ہیں؟ مُجھے یقین ہے کہ آپ جانتے ہیں۔ جلدی بتایئے۔"

"نہیں۔ مُجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں نہیں جانتا تُمھارے بادشاہ کی بیٹیاں کہاں ہیں۔ "

بُوڑھا اپنی داڑھی چھُڑانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا اور اولیو اُس سے شہزادیوں کا اتا پتا پُوچھنے پر اڑا ہوا تھا۔ کافی دیر اِسی طرح گُزر گئی۔ بُوڑھا کمر کے بل جھُکا جھُکا تھک گیا۔ لکڑی میں سے داڑھی کھینچنے کی کوشش سے اُس کی سانس پھُول گئی۔ کبھی سر کو آگے کر کے زور لگاتا، کبھی پیچھے کو کھینچتا۔ آخر تنگ آ کر بُوڑھے نے ہار مان لی اور ہانپتے ہوئے بولا:

"ٹھیک ہے۔ تم جیتے، میں ہارا۔ اب میں بتاتا ہوں کہ تینوں شہزادیاں کہاں ہیں۔ مگر وعدہ کرو کہ تُم مُجھے اس شکنجے سے چھڑا دو گے۔ غُور سے سنو۔ مشرق کی طرف مُنہ کر کے تین دن تین راتیں ناک کی سیدھ میں چلتے رہو تو ایک بُلند پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ جاؤ گے۔ یہاں تُمھیں ایک گول، چپٹا پتھّر نظر آئے گا۔ اس پتھّر کو اس کی

جگہ سے ہلا دینا، یہ پتھّر بہت بڑا اور بُہت بھاری ہے۔ جب وہ اپنی جگہ سے ہٹے گا تو ایک گہرا اندھیرا غار نظر آئے گا۔ اس غار میں چلے جانا۔ ڈرنا ہرگز نہیں۔ ڈر سے تو کام بگڑ جائے گا۔ ہمّت سے کام لینا۔ نیچے جانے والی سیڑھیوں پر چلتے ہوئے تم کبھی آگ پر سے گزرو گے اور کبھی پانی پر سے۔ یہ رستہ بڑا لمبا، بڑا دُشوار اور بڑا خطرناک ہے، لیکن ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ ہمّت سے کام لیا اور حوصلہ رکھا تو تمام مُشکلات کا مقابلہ کر لو گے۔ “

یہ سُن کر اولیو نے فوراً بوڑھے کو آزاد کیا اور مشرق کی طرف ناک کی سیدھ میں چل دیا۔ وُہ جتنا تیز چل سکتا تھا چل رہا تھا۔

تین دن، تین راتیں لگا تار چلنے کے بعد اولیو سب سے بُلند پہاڑ کی سب سے اُونچی چوٹی پر پہنچ گیا۔ بالکل اُسی جگہ جہاں بڑے میاں نے بتایا تھا۔ اُسے بڑے میاں کے بتائے ہوئے پتھّر کو تلاش کرنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ یہ پتھّر بُہت بڑا، چپٹا اور گول تھا۔ اولیو نے پتھّر کو اس کی جگہ سے ہلانا شروع کر دیا، وہ اسے پوری طاقت سے کھینچتا تھا، دھکیلتا تھا۔ کبھی اِس طرف سے کبھی اُس طرف سے۔ آخر آولیو

نے سر سے پاؤں تک کا پورا زور لگا کر پتھّر کو دھکیلا، پھر پرے ہٹ گیا۔ نیچے گہرا اور اندھیرا غار تھا۔ آولیو نے گھٹنوں کے بل جھُک کر نیچے جھانکا۔ راستہ نیچے دُور تک چلا گیا تھا۔ مگر اندھیرا اس قدر تھا کہ کچھ صاف دکھائی نہ دیتا تھا۔ اچانک اُسے بڑے میاں کے الفاظ یاد آ گئے۔ "ہمّت سے کام لینا، پھر مُشکل مُشکل نہ رہے گی، ساتھ ہی اُس کو شہزادیوں کا خیال آیا جن کے بال سُنہری دُھوپ کی طرح چمک دار اور آنکھیں صاف آسمان کی طرح نیلی تھیں۔ یہ خیال آتے ہی وہ اندھیرے میں کود گیا۔

اس کے پیر اپنے آپ سے ہی نیچے جا رہے تھے۔ پہلے تو وہاں گہرے اندھیرے کے سوا کچھ نہ تھا۔ پھر اچانک تیز روشنی ہو گئی۔ اولیو کو ایسے لگا جیسے وہ دہکتی آگ اور بھڑکتے شعلوں پر چل رہا ہے۔ تھوڑی دیر یہ حالت رہی، پھر یوں احساس ہوا جیسے ٹھنڈے برف پانی میں کُود گیا ہے۔

اس کے بعد اُس نے دیکھا کہ وہ ایک بہت بڑے ہال کے فرش پر بیٹھا ہے۔ ہال میں مدّھم روشنی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ آگ اور پانی میں سے گُزر کر

آیا تھا۔ مگر اُس کے کپڑے نہ تو جلے تھے نہ بھیگے تھے۔ ہولے ہولے اُس کی آنکھیں دھیمی روشنی میں دیکھنے کے قابل ہو گئیں۔ اُس نے اِدھر اُدھر نظریں گھمائیں۔ ایک کونے میں کچھ سُنہری اور روپیلی چیزیں پڑی دمک رہی تھیں۔ وہ آہستہ سے اُٹھا اور اُس کونے کی طرف چلنے لگا۔ قریب جا کر دیکھا تو اُس کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔ یہ سونے اور چاندی کے ڈھیر تھے۔

وہ ان ڈھیروں کو دیکھ رہا تھا تو اُس کی نظر بائیں طرف دروازے پر پڑی۔ اس نے دروانے کو آہستہ سے کھولا۔ دروازہ چوپٹ کھُل گیا۔ سامنے ایک کمرا تھا۔ اس نے سر اندر کر کے غور سے دیکھا، دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ کمرے کے بیچ میں سب سے چھوٹی شہزادی جیرِ دا سر جھُکائے بیٹھی سِسکیاں لے رہی تھی۔ چہرہ گھنے سُنہری بالوں میں چھُپا ہُوا تھا۔ کمرے میں اُس کے سوا کوئی نہ تھا۔ جب اولیو نے دروازے پر دستک دی تو شہزادی نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ وُہ ایک انسان کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اُس نے سِسکیاں لیتے ہوئے کہا:

”آہ! آہ۔۔۔!“ شہزادی کی آواز میں خُوشی اور غم دونوں تھے۔ ”آپ کون

ہیں، اور یہاں کیسے آئے ہیں؟ کیا آپ کو پہاڑی جِن اُٹھا کر یہاں لایا ہے؟"شہزادی نے ایک ساتھ کئی سوال کر دیے۔

"نہیں ہیں خُود آیا ہوں۔ میں آپ کو اور آپ کی بہنوں کو تلاش کرتا ہوا یہاں آیا ہوں۔ میرا نام اولیو ہے۔" اولیور نے شہزادی کو بتایا۔

جیر دا دوڑ کر اولیو کے پاس آگئی "آہ! تو تُم ہمیں ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہو۔ شکر ہے۔ ملک میں کوئی تو ایسا بہادر ہے جو یہاں تک پہنچ گیا۔ میرا خیال تھا ہم اس قید خانے سے کبھی زندہ سلامت نہیں نِکل سکیں گے۔ شکر ہے، کوئی تو چھڑُانے آیا۔"شہزادی حیرت اور خُوشی سے بولتی چلی گئی۔

اچانک شہزادی نے اولیو کا بازو پکڑ لیا اور کہا۔ "نہیں میں تُمہیں یہاں نہیں رہنے دوں گی۔ فوراً چلے جاؤ۔ اگر جِن نے دیکھ لیا تو تُمہیں کچّا چبا جائے گا۔ جلدی کرو۔ یہاں سے بھاگ جاؤ۔"

اولیو نے نرمی سے شہزادی کے ہاتھ کو تھپتھپایا اور کہا۔ "شہزادی، میں یہاں آپ کو اور آپ کی بہنوں کو جِن کی قید سے چھڑُانے کے لیے آیا ہوں اور آپ کو ساتھ

لے کر ہی جاؤں گا۔ میں اس ظالم اور مکّار جِن کو جان سے مار دوں گا جس نے آپ کو اِتنی مُدّت سے قید کر رکھا ہے۔“

شہزادی جیر داخُوشی سے دیوانی ہوئی جارہی تھی۔ کہنے لگی:

”تم کتنے بہادر ہو۔ اب ہمیں جلدی سے کوئی بندوبست کر لینا چاہیے کیوں کہ جِن آنے ہی والا ہے۔ وُہ تلوار لے لو جو سامنے دیوار پر لٹک رہی ہے۔ ذرا گھُما کر دیکھو تُم اسے چلا بھی سکتے ہو یا نہیں۔“

اولیو نے پورا زور لگا کر تلوار کو اُتارنا چاہا، مگر وہ اپنی جگہ سے ایک اِنچ نہ ہلی، وہ بہت مایوس ہوا۔ تلوار چلانے کی بات تو الگ رہی، وہ تو اُسے دیوار سے اُتار بھی نہ سکتا تھا۔ اس نے بار بار کوشش کی مگر سب کوششیں بے کار گئیں۔ یوں لگتا تھا تلوار دیوار پر لٹک نہیں رہی، اُس کے اندر گڑی ہوئی ہے۔

اولیور کا چہرہ اُتر گیا۔ جیر دا اُس کو اُداس دیکھ کر اس طرح چلّائی جیسے کوئی اہم بات یاد آگئی ہو:

”اوہ! میں تو بھُول ہی گئی تھی۔ یہ تلوار کے پاس سینگ لٹک رہا ہے نا۔ اس میں شربت ہے۔ ایک گھونٹ پی لو۔ پھر تُم میں تلوار اُٹھانے کی طاقت آجائے گی۔ “

اولیو نے جھٹ سے سینگ اُتارا اور شربت کا بڑا سا گھُونٹ بھرا۔ اب اُس نے ایک ہی ہاتھ سے تلوار اُتار لی اور سر کے اُوپر گھُما کر دیکھا۔

"شہزادی، دیکھو، دیکھو۔ میں اِسے گھُما سکتا ہوں۔" اُسی وقت ہر طرف بھیانک شور پھیل گیا۔ یوں لگتا تھا۔ آندھی، طوفان، گرج، کڑک سب اکٹھے ہو کر چھوٹے سے کمرے میں آنا چاہتے ہیں۔ شہزادی زور سے چلّائی۔ "جلدی کرو، جلدی۔۔۔ دروانے کے پیچھے چھُپ جاؤ۔ "

کمرے کا دروازہ زور زور سے کانپنے لگا۔ پھر دھاڑ دھاڑ کرتا ایک بہت بڑا جِن اندر آ گیا۔ اُس کے تین سر تھے۔ وہ اِتنا لمبا تھا کہ اُس کے سر چھت سے ٹکراتے تھے، چلتا تھا تو پورا گھر ڈولنے لگتا تھا۔

"ہو۔۔۔ ہو۔۔۔ آدم بُو۔" جِن زور سے دھاڑا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔" اولیو نے دروازے کے پیچھے سے جواب دیا۔ "تُمہیں ابھی پتا چلتا ہے۔ "

یہ کہہ کر وہ کُود کر میز پر چڑھ گیا اور جب جِن اُس پر جھپٹنے کے لیے آگے کو جھُکا تُو اس نے تلوار گھُما کر ایک ہی وار میں اُس کے تینوں سر تن سے جدا کر دیے۔

شہزادی جیر داجِن کی موت پر خوشی سے ناچنے لگی۔ اولیو بھی خُوش تھا۔ کچھ دیر تو اُنہیں کُچھ بھی یاد نہ رہا۔ جِن کی موت بہت بڑی بات تھی۔

”اب دوسری شہزادیوں کو چھُڑانا چاہیے۔“ جیر دانے اولیو سے کہا۔

”آپ مُجھے بتائیں کہ آپ کی دوسری دو بہنیں کہاں ہیں؟ وہ کہیں دُور ہیں یا نزدیک ہی ہیں؟“ اولیو نے پوچھا۔ جیر دانے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا:

”وُہ یہاں سے بہت دُور ہیں۔ اگر تُم مشرق کی جانب تین دِن اور تین راتیں ناک کی سیدھ میں چلتے رہے تو اس جگہ پہنچ جاؤ گے جہاں میری منجھلی بہن الزبتھ قید ہے۔ لیکن اولیو، مُجھے بھی ساتھ لے چلو۔“

”نہیں۔ آپ ساتھ نہیں چلیں گی۔ راستے میں بڑی تکلیفیں اور مُشکلیں پیش آئیں گی۔ آپ یہاں رہ کر میری واپسی کا انتظار کریں۔“

جیر دانے اُداسی سے کہا۔ ”اچھّا جیسی تُمہاری مرضی۔“

جیر دا چاہتی تھی کہ اولیو اُسے اکیلا چھوڑ کر نہ جائے۔ لیکن بہنوں سے ملنے کے

خیال سے وہ خوش ہوگئی اور جُوش سے بولی:

”خدا حافظ! میں تُمہاری کامیابی کی دُعا کرتی رہوں گی۔ تُم نے مجھ پر جو احسان کیا ہے اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ جاؤ اللہ کے حوالے۔“

اولیو پھر تین دن اور تین راتیں لگاتار۔ مشرق کی سمت ناک کی سیدھ میں چلتا رہا۔ اُس نے ایک جِن کو قتل کر کے شہزادی جیر دا کو اُس کی قید سے چھڑُالیا تھا۔ اب اس کو اُمّید تھی کہ وہ دوسرے جِن کو بھی موت کے گھاٹ اُتار دے گا۔ سُنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والی جیر دا کا خیال اُسے آگے بڑھنے کا جوش دلا رہا تھا۔ وہ جلدی جلدی مُہم سر کر کے چھوٹی شہزادی جیر دا کے پاس واپس آنا چاہتا تھا۔ اس کی ہمّت اور حوصلہ پہلے سے کہیں زیادہ جوان تھا۔

جب تین دن اور تین راتوں کا سفر ختم ہوا تو وہ ایک بڑے سے دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ یہ دروازہ پہلے جِن والے دروازے جیسا تھا لیکن کُچھ بڑا اور بھاری دکھائی دیا تھا۔ اولیو نے دروازے کو اچھّی طرح دیکھا بھالا اور پھر زور سے دھکا

دیا۔

دروازہ چوپٹ کھُل گیا۔ سامنے ایک بہت بڑا لیکن ویران کمرہ نظر آیا۔ اس میں سُنہری بالوں والی شہزادی سر جھکائے بیٹھی رو رہی تھی۔ اس مرتبہ اولیو حیران نہ ہوا۔ یہ شہزادی الزبتھ تھی۔ جُوں ہی دروازہ کھُلا، شہزادی نے اپنا غمگین چہرہ اُٹھا کر اولیو کی جانب دیکھا۔ اپنے سامنے ایک انسان کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔

"تم کون ہو، اور یہاں کیا کر رہے ہو؟" شہزادی نے پُوچھا۔ "میرا نام اولیو ہے اور میں آپ کو جِن کی قید سے رہائی دلانے آیا ہوں۔ آپ کی چھوٹی بہن جیرا جِن کی قید سے آزاد ہو چُکی ہے۔" اولیو نے بڑے ادب سے جواب دیا۔

"سچ۔۔۔؟" شہزادی کو اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ "سچ؟ تُم نے جِن کو قتل کر دیا؟ سچ مُچ میری بہن آزاد ہو گئی؟ کتنی حیرت کی بات ہے! تم سچ کہہ رہے ہو نا؟"

"بالکل سچ۔ آپ خود چل کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔" اولیو نے کہا۔

"تم بڑے بہادر ہو۔ میں نے تم جیسا بہادر کبھی دیکھا، نہ سُنا۔ اب ہمیں ہوشیار ہو جانا چاہیے۔ جِن کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔ تم وہ تلوار لے لو جو سامنے کی دیوار پر لٹک رہی ہے۔ اور ہاں، اس کو ذرا گھُما پھِرا کر بھی دیکھ لو۔ سُنا ہے بہُت بھاری ہے۔"

اولیو نے جھپٹ کر دیوار پھر سے تلوار اُتارنی چاہی۔ دونوں ہاتھوں سے زور لگایا، مگر تلوار جہاں تھی وہیں رہی۔ ذرا بھی اِدھر اُدھر نہ ہوئی۔ بے چارہ اولیو کچھ مایوس سا ہو گیا۔ اُسے اُداس دیکھ کر الزبتھ بولی:

"اوہ! میں تو بھُول ہی گئی۔ یُوں کرو کہ تلوار کے پاس دیوار پر جو سینگ لٹک رہا ہے، اس میں سے تھوڑا سا شربت پی لو۔ اس کے پیتے ہی تُم میں طاقت آ جائے گی اور پھر آسانی سے تلوار اُٹھا سکو گے۔"

اولیو نے جھٹ سینگ اُتارا اور اس میں سے تھوڑا سا شربت پیا۔ ایک دم اُس کے بدن میں بجلی سی دوڑ گئی۔ تلوار پر ہاتھ ڈالا تو ایسے لگا جیسے اُس کا کون وزن ہی نہیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے تلوار پکڑ کر گھُمائی۔ اب وہ اسے استعمال کر

سکتا تھا، پھر اُس نے ایک اور گھونٹ پیا اور تلوار سونت کر تیّار ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد فضا میں خوفناک گڑگڑاہٹ ہوئی۔ یُوں لگتا تھا کہ دو بڑے بڑے ہیبت ناک پہاڑ آپس میں ٹکرا رہے ہیں۔

"جلدی کرو، جلدی۔" الزبتھ نے اولیو کو خبر دار کیا۔ "دروازے کے پیچھے چھُپ جاؤ۔ جِن آ گیا ہے۔ "

اولیو ابھی دروازے کے پیچھے ہوا ہی تھا کہ دروازہ ایک دھماکے کے ساتھ کھُل گیا۔ اور جِن بھد بھد کرتا کمرے میں داخل ہوا۔ یہ پہلے جِن سے کہیں بڑا تھا۔ اس کے تین کے بجائے چھ سر تھے اور کمرے کی چھت سے ٹکرا رہے تھے۔ وہ کمرے میں بڑی مُشکل سے کندھے جھُکا کر چل سکتا تھا۔ سیدھا چلتا تو سر چھت پھاڑ کے باہر نکل جاتے۔ وہ سانس لیتا تو یوں لگتا کہ دروازے اور کھڑکیاں ٹوٹ جائیں گی۔ اس نے آتے ہی کہا :

"آدم بو، آدم بو۔ یہاں کوئی ہے؟" اس کی آواز سے کمرا گونجنے لگا۔

”ہاں، ہاں۔۔۔۔ ہے۔۔۔ ابھی پتا چلتا ہے کہ کون ہے؟“ اولیو یہ کہہ کر ایک اُونچی کُرسی پر چڑھ گیا اور وہاں سے مینٹل پیس پر کُود گیا۔ پھر تلوار کے دستے کو مضبُوطی سے تھام کر زور سے گھُمایا اور ایک ہی وار میں جِن کے چھ سر کاٹ کر الگ کر دیے۔

جِن کے مرتے ہی دُوسری شہزادی بھی آزاد ہو گئی۔ وہ تالیاں بجاتی آگے بڑھی اور اولیو کا ہاتھ پکڑ کر ناچنے لگی۔ اولیو نے کہا:

”اب مُجھے آپ کی تیسری بہن کو تلاش کرنا ہے، یہ بتائیں کہ وہ کہاں قید ہے؟“

”بہت دُور۔۔۔ افسوس! یہ سفر اتنا ہی لمبا ہے جتنا تُم طے کر کے یہاں پُہنچے ہو، تین دِن تین راتیں مشرق کی طرف ناک کی سیدھ میں چلتے جاؤ تو اس مکان پر پہنچ جاؤ گے جہاں میری بڑی بہن ماریا قید ہے۔ میں تو سوچ کر کانپ جاتی ہوں، لیکن تُم بڑے بہادُر ہو۔ مُجھے یقین ہے تم وہاں پہنچ جاؤ گے اور میری بڑی بہن کو ظالِم جِن کی قید سے چھُڑالاؤ گے۔ میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔ شاید تُمہارے کام آ سکوں۔“

اولیو نے کہا۔ ”آپ فکر نہ کریں۔ میں جلد ہی واپس آ جاؤں گا۔ آپ کا ساتھ چلنا ٹھیک نہیں۔ “

الزبتھ نے اولیو کی بات مان لی اور شکریہ ادا کر کے اس کو سفر پر روانہ کیا۔ اولیو نے الزبتھ کو خُدا حافظ کہا، کُچھ کھانے پینے کی چیزیں ساتھ لیں اور تیسری شہزادی کو آزاد کرانے کے لیے چل دیا۔

وہ تین دِن تین راتیں مشرق کی سمت ناک کی سیدھ میں چلتا رہا۔ اب اس کی چال میں پہلے سے بھی زیادہ تیزی تھی۔ دو مشکل مُہمیں سر ہو چکی تھیں اور تیسری مُہم سر کرنے کے بعد اُس کی منزل قریب آنے والی تھی۔

سفر ختم ہوا تو اولیو ایک بہت بڑے دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ یہ دروازہ پچھلے دو دروازوں سے اُونچا اور بڑا تھا۔ اولیو نے دروازے پر پورا بوجھ ڈال کر زور لگایا۔ وہ آہستہ سے کھُل گیا۔ سامنے ایک بڑا سا کمرا تھا۔ اس میں مدّھم روشنی ہو رہی تھی۔ دیواریں اتنی اُونچی تھیں کہ چھت تک نظر نہیں پہنچتی تھی۔

اولیو نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ پہلی نظر میں

شہزادی کہیں نظر نہ آئی۔ جب آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو گئیں تو پتا چلا کہ شہزادی ایک کونے میں فرش پر بیٹھی ہے، سر گھٹنوں میں دبا ہوا ہے اور سِسکیاں لے لے کر رو رہی ہے۔ اولیو نے شہزادی کو سلام کیا تو اُس نے گردن گھُما کر اس کی طرف دیکھا اور پُوچھا :

”تم کون ہو اور اِس خوفناک جگہ کیا لینے آئے ہو؟“

”میرا نام اولیو ہے۔ میں آپ کو جِن کی قید سے چھُڑانے آیا ہوں۔“ اولیو نے بتایا۔

”کیا یہ سچ ہے؟ کیا واقعی تُم مُجھے رِہائی دلانے کے لیے آئے ہو؟ کیا دنیا میں ایسے بہادُر لوگ بھی ہیں؟ مُجھے یقین نہیں آتا۔“ ماریا حیران ہو کر کہہ رہی تھی۔

اولیو نے بتایا کہ وہ اس کی دونوں چھوٹی بہنوں کو رہائی دِلا چُکا ہے۔ وہ دونوں جِن مَر چُکے ہیں جنھوں نے شہزادیوں کو قید کر رکھا تھا۔

”میری بہنوں کا کیا حال ہے؟ وہ ٹھیک تو ہیں؟ اور کیا دونوں جِن واقعی مر چکے

ہیں؟"ماریا کو یقین نہ آتا تھا۔

"آپ یقین کریں، میں نے دونوں جِنوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا ہے اور اب اِس جِن کا خاتمہ کرنے آیا ہوں جِس نے آپ کو قید کر رکھا ہے۔"

ماریا نے بھی اپنی بہنوں کی طرح اولیو کو دیوار پر لٹکی ہوئی تلوار اُتارنے کے لیے کہا۔ یہ تلوار بُہت ہی بڑی تھی۔ پہلی تلواریں جِن سے اولیو نے جِنوں کو قتل کیا تھا، بھی عام تلواروں سے کہیں بڑی تھیں مگر اِس تلوار کی بات ہی دُوسری تھی۔ یوں لگتا تھا کہ دیوار پر لوہے کا شہتیر لٹک رہا ہے۔ اولیو نے تلوار اُتارنے کی کوشش کی تو وہ اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلی۔ اس نے پُورا زور لگا کر ہلایا مگر بے سُود۔ مایوس ہو کر وہ کھڑا ہو گیا۔ شہزادی ماریا کو اچانک کوئی بات یاد آ گئی۔ وہ بولی:

"اوہ یاد آیا۔ میں تو بالکل بھُول گئی تھی یہ دیوار پر جو سینگ لٹکا ہوا ہے اس میں سے تھوڑا سا شربت پی لو۔ شربت پی کر بڑی آسانی سے تُم تلوار اُٹھا لو گے۔ جلدی کرو۔ جِن آنے ہی والا ہے۔"

اولیو نے فوراً سینگ اُتارا اور جلدی سے شربت کا گھُونٹ بھرا۔ پھر تلوار اُتارنے

کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ مگر وہ صرف ہل سکی، ابھی اولیو میں اِتنی طاقت نہیں آئی تھی۔ اس نے پھر دو گھونٹ پیے۔ اب وہ تلوار اُٹھا سکتا تھا مگر گھُما نہیں سکتا تھا۔ اُس نے شربت کے تین چار گھُونٹ اور پیے۔ اب وہ تلوار کو گھُما بھی سکتا تھا۔

جوں ہی اولیو نے تلوار پکڑ کر ہوا میں لہرائی، ایک خُوفناک گرج سُنائی دی۔ اولیو کو ایسا لگا جیسے زبردست زلزلہ آ گیا ہے۔

شہزادی ماریا بھاگ کر اولیو کے قریب آ گئی اور اُسے دروازے کے پیچھے دھکیل دیا۔ پھر اُس کے کان پر مُنہ رکھ کر زور سے بولی :

"یہیں چھُپے رہو۔ ذرا بھی ہلے تو کام خراب ہو جائے گا۔ میں جِن کو سُلا دوں گی، تُم اس کو سوتے میں قتل کر دینا۔

پھر وہ دوڑ کر کمرے کے درمیان میں چلی گئی۔ اُسی وقت دھماکے سے کمرے کا دروازہ کھُلا اور ایک ہیبت ناک جِن بھاری بھاری پاؤں زمین پر مارتا اندر داخل ہوا۔ اس کے نو سر تھے لیکن ان نو بھیانک سروں کے درمیان صرف ایک ہی آنکھ تھی۔

"اوہو۔۔۔!" جِن گرجا۔

اولیو نے تلوار کے دستے کو مضبُوطی سے تھام لیا اور فرش پر رکھے ہوئے قالین کو سختی سے پکڑ لیا۔ جِن کے گرجنے سے ایسے لگا جیسے کمرے کی ہر چیز اُڑ جائے گی۔ جِن دھاڑ رہا تھا:

"آدم بو۔۔۔ آدم بو۔۔۔! یہاں کون ہے؟ یہاں کون ہے؟"

ماریا نے نرمی سے جواب دیا۔ "آج سہ پہر یہاں ایک لڑکا آیا تھا اور میں اسے تُمھارے کھانے کے لیے پکا رہی ہوں۔ تُم بُہت تھکے ہوئے لگتے ہو۔ تھوڑی دیر لیٹ کر آرام کر لو۔ اتنے میں مَیں کھانا تیّار کرتی ہوں۔ "

جِن نے دہشت ناک آواز میں کہا، "اچھّا۔" اور پھر آرام کرنے کے لیے قالین پر لیٹ گیا۔ جلد ہی اُسے نیند آ گئی، وہ اپنی نونا کوں سے خرّاٹے لینے لگا۔

اولیو چُپکے سے دروازے کے پیچھے سے نِکلا اور تلوار سونت کر سوئے ہوئے جِن کے سرہانے جا کھڑا ہوا۔ پھر اُس نے پوری طاقت سے تلوار لہرائی اور دیو کے

سروں پر ایسا بھرپور وار کیا کہ آٹھ سر کٹ کے دُور جا گرے۔ ایک سر پھر بھی بچ گیا۔ جِن ہائے! ہائے! کرتا جاگ اُٹھا اور اولیو پر جھپٹ پڑا۔ وہ اس کو اپنے تنور جتنے بڑے حلق میں اُتار لینا چاہتا تھا لیکن اولیو بجلی کی سی تیزی سے پرے ہٹ گیا اور ایک دفعہ پھر تلوار لہرا کر جِن کے نویں سر پر ماری۔ تلوار کا وار ٹھیک پڑا۔ جِن کا آخری سر بھی کٹ گیا۔

اب تینوں شہزادیاں ماریا، الزبتھ اور جیر دا آزاد تھیں۔ اولیو نے شہزادی ماریا کا ہاتھ پکڑا اور دونوں اتنا تیز دوڑے جیسے ہوا کے گھوڑے پر سوار ہوں۔ اُن کی منزل وُہ مکان تھا جہاں منجھلی بہن الزبتھ اُن کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ تب سے دروازے میں کھڑی تھی۔

اولیو اور ماریا کو آتے دیکھ کر الزبتھ کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ اس نے آنکھیں مل مل کر دیکھا۔ یہ خواب ہے یا حقیقت؟ جب اُسے یقین ہو گیا کہ ماریا اور اولیو آ گئے ہیں تو وہ باہیں پھیلائے بے تحاشا اُن کی طرف دوڑی اور اپنی بہن سے لپٹ گئی۔

تینوں بے حد خُوش تھے، مگر ان کی خوشی ابھی مکمّل نہ ہوئی تھی کیوں کہ ابھی چھوٹی بہن جیر دا اُن سے کوسوں دُور تھی۔ جیر دا کا خیال آتے ہی تینوں پھر سفر پھر روانہ ہو گئے۔

بے چاری جیر دا بہنوں کی واپسی کی راہ دیکھ رہی تھی۔ دُور سے اولیو اور بہنوں کو گھر کی طرف آتے دیکھا تو جوش میں آکر خُود اُن کی طرف دوڑنے لگی اور اُن کو رستے ہی میں جا لیا۔ بہنوں کے گلے لگ کر خوب روئی۔ بہنیں بھی آنسو بہا رہی تھیں۔ لیکن یہ خوشی کے آنسو تھے۔ جیر دا بہنوں سے مل ملا کر اولیو کی طرف بڑھی اور بڑی بہنوں کو آزادی دِلانے کا شکریہ ادا کیا۔

پھر چاروں گھر کے اندر گئے جیر دا نے بڑی بہنوں کو سونے چاندی کے ڈھیر دِکھائے۔ چاروں نے مل کر تھیلوں میں سونے چاندی کی اِینٹیں بھریں۔ شہزادیوں نے اپنی جیبوں میں بھی سونا چاندی بھر لیا، کھانے پینے کا سامان جیر دا نے پہلے سے تیّار کر کے رکھا تھا۔ انہوں نے اپنے اپنے حِصّے کا بوجھ اُٹھایا اور چل پڑے۔

اولیو نے شہزادیوں کو بتایا کہ راستے میں اُنہیں آگ اور پانی میں سے گُزرنا ہو گا۔ اس نے شہزادیوں سے کہا:

"ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ حوصلہ رکھو گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

تینوں شہزادیاں اپنے پیارے ماں باپ سے ملنے کے اپنے بے تاب تھیں اور اِس کے لیے رستے کی ہر تکلیف برداشت کرنے کو تیّار تھیں۔ اولیو ان کو لے کر اُس ہال میں گیا، جس میں وہ آتے ہوئے داخل ہوا تھا۔ یہاں سیڑھیاں تھیں جو گھوم کر اُوپر چڑھتی تھیں۔ گھُپ اندھیرا تھا مگر چاروں لاپروائی سے ہنس رہے تھے۔

وہ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے اُوپر چڑھنے لگے اور آگے آگے تھا۔ اب وہ ٹھنڈے برف جیسے پانی کے تیز بہاؤ میں چلے گئے۔ اس میں ڈبکیاں کھاتے، اور پاؤں مارتے، آگے ہی آگے بڑھ رہے تھے۔ اس کے فوراً بعد وہ بھڑکتی ہوئی آگ کے اُوپر تیرتے ہوئے جا رہے تھے۔ یہاں ہر طرف لال شعلے ناچ رہے تھے۔ روشنی سے آنکھیں چُندھیا رہی تھیں۔ پھر ایک دم گہرے اندھیرے میں آ گئے۔ اِس کے بعد اُنہیں یُوں لگا جیسے وہ بالکل ساکت کھڑے ہیں، کوئی حرکت نہیں کر رہے۔

اُن کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُنہیں معلُوم ہوا کہ وہ تو سب سے بُلند پہاڑ کی سب سے اُونچی چوٹی پر کھڑے ہیں۔ یہاں چاروں طرف کھُلی فضا تھی۔ اُوپر

نیلا آسمان تھا۔ شور مچاتی ندیاں تھیں اور رنگ برنگ کے پرندے تھے۔ اولیو خُوشی سے جھُوم کر چیخا:

"یہ تو وہی جگہ ہے جہاں سے میں اندر داخل ہوا تھا۔ ٹھہریے! ہم ابھی باہر نکلتے ہیں۔" ایک لمحے میں اس نے غار کے دہانے پر پڑے بھاری، گول اور چپٹے پتھّر کو پرے سرکا دیا۔ اب وہ رُوشنی میں تھے۔ اب ان کی تمام مُصیبتیں ختم ہو گئی تھیں۔ یہاں سے وہ ہنستے، گاتے اپنے شاہی محل کی طرف روانہ ہوئے۔

محل کے مینار پر کھڑے پہرے دار کو دُور چار چھوٹے چھوٹے نُقطے سے دکھائی دیے۔ پھر یہ نُقطے ہوتے ہوتے بڑے ہوتے گئے اور پہرے دار کو بونوں کی طرح کی کوئی مخلوق نظر آنے لگی۔ جب ذرا اور قریب آئے تو پہرے دار نے تینوں شہزادیوں کو پہچان لیا۔

جب وہ محل کے دروازے کے پاس پہنچے تو محل میں نقّارے بجنے لگے۔ بگل کی آواز بُلند ہوئی۔ محل کی چھتّوں پر جھنڈے لہرا دیے گئے۔ غرض محل میں رہنے والا ہر شخص خُوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ بوڑھی ملکہ اور بادشاہ اپنی پیاری بیٹیوں کو

زندہ سلامت دیکھنے کی اُمّید کھو چُکے تھے۔ خُوشی کے مارے اُن کے آنسو تھمتے ہی نہ تھے۔

تین ہفتوں تک مُلک بھر میں جشن منایا گیا۔ محل میں بہت بڑی ضیافت کا انتظام کیا گیا۔ لوگ ناچتے تھے اور گاتے تھے۔ بہادُر اولیو کا نام ہر زبان پر تھا۔ سارے ناروے میں اُس کی دھوم مچی ہوئی تھی۔

اولیو کی بوڑھی ماں کو جب پتا چلا کہ اس کا چُپ چاپ رہنے والا بیٹا کتنا عقل مند اور بہادُر ہے، اس کو اپنے بیٹے پر فخر تھا۔ خُوشی کے مارے اُس کے مُنہ سے الفاظ نہ نکلے تھے۔ اولیو بھی خُوش تھا لیکن اُسے اصلی خُوشی تب ہوئی جب بادشاہ نے اپنی چھوٹی بیٹی جیرڈا کی شادی اُس کے ساتھ کر دی۔

بادشاہ نے وعدے کے مطابق اپنی آدھی سلطنت اور آدھا خزانہ بھی اولیو کے سپرد کیا۔ بڑی بہنوں کی شادیاں بھی اچھّی اچھّی جگہ کر دی گئیں اور سب اپنے اپنے گھروں میں ہنسی خوشی رہنے لگے۔

نیک دِل چُڑیل

ناروے میں چڑیوں کو ہلڈر کہتے ہیں۔ یہ کہانی انہی چُڑیلوں کی ہے۔

بھُتنیاں یا چُڑیلیں بے حد بد صُورت اور ڈراؤنی ہوتی ہیں۔ اُنہیں جادُو اور منتر بھی آتا ہے۔ اس لیے وہ بڑی طاقت ور ہوتی ہیں اور جو چاہیں کر سکتی ہیں۔ جہاں چاہیں جا سکتی ہیں۔ یہ تعداد میں بہت کم ہیں، اس لیے بہت کم لوگوں کو نظر آتی ہیں۔

گرمیوں کی خاموش سہ پہر میں یہ چُڑیلیں جنگل کے اُس حِصّے میں سیر کرنے نِکلتی ہیں جہاں کُچھ کھُلی جگہ ہو۔ گھاس اُگی ہوئی ہو اور مویشی چرنے آتے ہوں۔

ایسی جگہ پر کبھی کبھی چرواہوں کی مُلاقات ان چُڑیلوں سے ہو جاتی ہے۔ چُڑیلیں ان سے میٹھی میٹی باتیں کرتی ہیں۔ اور کہتی ہیں، آؤ، ہمارے ساتھ چلو۔ ہم تُمھیں سُونے چاندی کے پہاڑوں میں لے جائیں گے۔ جنّت کی سیر کرائیں گے۔ چرواہے بے چارے سیدھے سادھے ہوتے ہیں۔ ان کی باتوں میں آ جاتے ہیں اور اُن کے ساتھ چل پڑتے ہیں۔

چُڑیل چرواہے کو اپنے مکان میں لے جاتی ہے تو گھر میں داخل ہوتے ہی اُس کی شکل بدل جاتی ہے، کالا سیاہ رنگ، لال انگاراسی آنکھیں، لمبے لمبے پیلے دانت، موٹے موٹے لٹکتے ہوئے نیلے ہونٹ، لوہے کی تاروں کی طرح اکڑے ہوئے بال اور حلق سے خرخر کی نکلتی ہوئی خوف ناک آواز۔

خیر، میں آپ کو ایک راز کی بات بتاتی ہوں۔ چُڑیل کی ایک خاص نشانی ہوتی ہے۔ اگر آپ کی مُڈ بھیڑ کِسی چُڑیل سے ہو جائے تو آپ اس کے پیچھے جا کر دیکھیں، اُس کے دُم ہو گی۔ گائے کی دُم جتنی لمبی اور اتنی ہی موٹی۔ اس دُم کو چڑیل نہ اُتار کر پھینک سکتی ہے اور نہ کِسی طرح بچا سکتی ہے۔ وہ کوئی بھیس بدلے،

دُم نظر آتی رہے گی۔

چُڑیلیں کئی کئی رُوپ دھار سکتی ہیں۔ کبھی خُوبصُورت شہزادی بن گئیں، کبھی رنگ برنگ کی چڑیاں۔ وہ اپنی جادُو کی گول ٹوپی سر پر رکھ کر نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں اور کسی کو نظر نہیں آتیں۔ بھُتنے جنگلوں اور ویرانوں میں رہنا پسند کرتے ہیں، مگر اُن کی بیٹیاں یعنی چُڑیلیں اکثر شام کے وقت جنگلوں سے باہر آبادیوں کے قریب بھی آ جاتی ہیں۔ اُنہیں انسان بُہت اچھّے لگتے ہیں۔ سُنا ہے کِسی زمانے میں وہ ننّھے مُنّے بچّوں کو جھُولے میں سے اُٹھا کر لے جایا کرتی تھیں اور اُس کی جگہ اپنا کالا کلوٹا، بد شکل ضدّی بچّہ چھوڑ جایا کرتی تھیں۔ بھُتنیوں کے یہ بچّے ہر وقت روتے رہتے تھے، اتنا کھاتے اتنا کھاتے کہ پیٹ ہی نہ بھرتا۔ سارا دن اور ساری رات کھانے کو مانگتے اور چیخ چیخ کر آسمان سر پر اُٹھائے رکھتے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے، ناروے کے کِسی گاؤں میں ایک کسان اور اُس کی بیوی رہتے تھے۔ اُن کا ایک پیارا سا بچّہ تھا، جس پر وہ جان چھڑکتے تھے۔ سخت گرمی کا موسم تھا اور گھاس کی کٹائی کے دن تھے۔ ایک دِن وُہ مُنّے کو کھیتوں میں لے گئے۔ ماں

نے سوچا کام بھی کروں گی، اور بچّے کو بھی دیکھتی رہوں گی۔ بھُوک لگے گی تو دُودھ پلا دُوں گی۔

جب دِن ڈھلا اور آگ کے گولے جیسا سورج مغربی پہاڑیوں کے پیچھے ڈوبنے لگا

تو کسان اور اس کی بیوی نے اپنا کام ختم کیا اور واپس جانے لگے۔ بچّہ دِن بھر درختوں کے جھُنڈ میں نرم نرم گھاس کے ڈھیر میں لیٹا رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کبھی ماں اور کبھی باپ اس کو دیکھ لیا تھا۔ ماں دُودھ کی پلا آتی تھی۔ بچّہ خوشی سے کلکاریاں مارتا ہوا کھیل رہا تھا۔ لیکن جب ماں نے بچّے کو اٹھانا چاہا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کے راج دلارے کی جگہ ایک چھوٹا سا سُوکھا، مریل، کال کلوٹا بد شکل بھُتنا لیٹا چیخ رہا تھا۔ ماں فوراً سمجھ گئی کہ کسی چُڑیل نے بچّہ بدل لیا ہے۔ ماں باپ کا غم سے بُرا حال ہو گیا۔ کریں تو کیا کریں؟ لگتا تھا ماں تو مُنّے کی جُدائی میں پاگل ہو جائے گی۔

دونوں میاں بیوی راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر بچّے کو تلاش کرنے جاتے تھے۔ ایک پل کو نیند نہ آتی تھی۔ پھر ان کو ایک ترکیب سُوجھی، جس میں مُنّے کو واپس لایا جا سکتا تھا۔ لیکن یہ ترکیب ایک ماں کے لیے بے حد مُشکل تھی۔ ماں تو کسی کے بچّے کو بھی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی۔ لیکن اس کو اپنا دِل پتھّر کرنا پڑا۔ اس نے چُڑیل کے بچّے کو دو دِن بھر پیار نہ کیا، نہ کھلایا پلایا۔ وہ بِلک بِلک کر روتا رہا اور ماں کو بُلاتا

رہا۔ کسان کی بیوی نے کانوں میں اُنگلیاں ٹھُونس لیں تا کہ بچّے کے رونے سے اُس کا دل نہ پگھلے۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس طرح روئے گا تو چُڑیل جہاں بھی ہو گی اُس کی چیخیں سُن کر ضرُور آئے گی اور اُس کو اُٹھا کر لے جائے گی۔ ماں چاہے اِنسان ہو یا بھُتنی، آخر ماں ہوتی ہے۔

آخر وہی ہوا جو کسان کی بیوی نے سوچا تھا۔ ایک دم تیز ہوا کے تیز جھکّڑ چلنے لگے۔ دروازے اور کھڑکیاں زور زور سے کھُلنے اور بند ہونے لگیں، پھر کمرے کا دروازہ دھڑ سے بند ہوا اور ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

کسان کی بیوی چُپ چاپ، دبے پاؤں پالنے کی طرف گئی۔ اس کے مُنہ سے خُوشی کی چیخ نِکل گئی۔ پالنے میں اُس کا اپنا پیارا مُنّا مُنہ میں انگوٹھا لیے مزے سے سو رہا تھا اور بھُتنی کا بچہ غائب تھا۔ مُنّے کو دوبارہ پا کر ماں باپ کو نئی زندگی مل گئی، وہ محبّت سے بچّے کو چومتے تھے، سینے سے لگاتے تھے۔

ایک دفعہ خزاں کے موسم میں کسان کا سب سے بڑا بیٹا ڈیوڑ پہاڑیوں پر بھیڑیں چرانے گیا۔ اس کی عمر یہی کوئی پندرہ سولہ برس کی تھی۔ بھیڑیں چرانے تو وہ ہر

روز جاتا تھا اور وقت پر گھر لوٹ آتا تھا، مگر آج دیر ہو گئی۔ وہ واپس نہ آیا۔ جُوں جُوں اندھیرا ہوتا جا رہا تھا، ماں باپ پریشان ہو رہے تھے۔ پھر اُنہوں نے یہ سوچ کر دِل کو تسلّی دے لی کہ ڈیوڈ آخر لڑکا ہے۔ کہیں سیر تفریح کرنے نِکل گیا ہو گا۔ دوست مِل گئے ہوں گے۔ جنگلی بیر اُسے بہت پسند ہیں۔ بیر کھانے چلا گیا ہو گا۔ یہی سوچتے سوچتے ساری رات گُزر گئی۔ ڈیوڈ واپس نہ آیا۔

اگلے دن کسان صُبح ہی صُبح بیٹے کو تلاش کرنے چل پڑا۔ اُس کے ساتھ اُس کے ہمسائے اور رشتے دار بھی تھے۔ اُسے ڈر تھا کہ ڈیوڈ کو بھُوتوں نے پکڑ لیا ہے، اس لیے جتنے آدمی زیادہ ہوں، اتنا ہی اچھا ہے۔ اُنہوں نے اپنے ساتھ گاؤں کے گرجا گھر کا بڑا گھڑیال بھی لے لیا تھا۔ جنگل کا کونا کونا چھان مارا مگر ڈیوڈ کا کہیں نشان تک نہ ملا۔ ہاں، اُس کی بھیڑ بکریوں کی ہڈّیاں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ جگہ جگہ خُون کے نشان بھی تھے۔ لگتا تھا کہ بے چاری بھیڑ بکریوں کو شیر اور بھیڑیے چیر پھاڑ کر کھا گئے۔ جنگل میں ڈھونڈنے کے بعد وہ پہاڑیوں پر چلے گئے جہاں گھنے جنگل تھے۔ وہ زور زور سے پُکارتے جا رہے تھے:

”ڈیوڈ!۔۔۔ڈیوڈ!۔۔۔۔بیٹے! کہاں ہو؟“

سارا دِن ڈھونڈتے پھرے۔ رات ہو گئی تو تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ دوسرا دِن بھی اِسی طرح گُزرا۔ ڈیوڈ کہیں نہ ملا۔ شام کے وقت وہ گر جا گھر کا گھڑیال بجاتے ایک اُونچی پہاڑی پر چڑھے۔ اُوپر پہنچ کر اُنہوں نے اِتنے زور سے گھڑیال بجایا کے اِرد گرد پھیلی ہوئی پہاڑیاں اور وادیاں گُونج اُٹھیں۔ سورج ڈوبا تو باپ کا دل بھی ڈوبنے لگا۔ اب ڈیوڈ کے ملنے کی کوئی اُمّید نہ تھی۔ اچانک ایک بوڑھا، جو اُن کے ساتھ تھا زور سے بولا:

”مل گیا۔ مل گیا۔ وہ دیکھو!“

اُنہوں نے دیکھا کہ ڈیوڈ پھُولوں کی ایک جھاڑی کے سائے میں سو رہا ہے، وہ سب اُس کے گرد جمع ہو گئے۔ ہر شخص پوچھ رہا تھا۔ ہزار قسم کے سوال کر رہا تھا۔ سب ایک ساتھ چیخ رہے تھے۔

”تم یہاں کیسے پہنچے؟ تمہیں گھڑیال کی آواز سنائی نہیں دی؟ تم یہاں آرام سے سوئے ہوئے ہو اور گھر والوں کی نیندیں حرام ہیں۔ کُچھ کھایا پیا بھی یا نہیں؟

عجیب لڑکے ہو۔ نہ گھر یاد آیا، نہ گھر والے۔ "

اُنہوں نے ایک ساتھ بے شمار سوال کر دیے لیکن ڈیوڈ اُن کی طرف ٹُکر ٹُکر دیکھ رہا تھا۔ مُنہ سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ یوں لگتا تھا، گونگا بہرا ہو گیا ہے۔ آنکھیں دُور کسی اور جگہ دیکھ رہی تھیں اور چہرے پر مُسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ کان کسی

غیبی آواز پر لگے ہوئے تھے جس کو دوسرے آدمی نہیں سُن سکتے تھے۔ شاید وہ چُڑیلوں کا گانا سُن رہا تھا۔

لوگ ڈیوڈ کو واپس گاؤں تو لے آئے مگر اب وہ پہلے جیسا ڈیوڈ نہ تھا۔ گاؤں کے رہنے والے اُسے دیکھ کر بہت افسوس کرتے۔ اُس کے پاس سے گُزرتے تو ایسے ڈرتے جیسے وہ پاگل ہو۔ اصل میں ڈیوڈ چُڑیلوں کے گھر سے ہو کر آیا تھا۔ چُڑیلوں کے گھر بھی جِنوں بھوتوں جیسے ہوتے ہیں۔ خوفناک اور اندھیرے۔ ڈیوڈ بے چارہ وہاں سے آ کر انسانوں کی دنیا سے بالکل الگ تھلگ رہنے لگا۔ دیکھنے والے اُس پر ترس کھاتے تھے۔

اس واقعے کے بعد کسان نے سوچا کہ اب اس گاؤں میں رہنا ٹھیک نہیں۔ چُڑیلیں پہلے ایک بیٹے کو اُٹھا کر لے گئیں۔ وہ واپس آیا تو دوسرے بیٹے کو لے گئیں۔ بس کسی اور جگہ چل کر رہنا چاہیے۔

یہ سوچ کر کسان نے اپنے کھیت بیچے اور بیوی بچّوں کو لے کر کہیں دُور چلا گیا۔ وہاں جا کر زمین خرید لی نیا مکان بنا لیا۔ لیکن مکان بناتے ہوئے وہ زمین میں

کُلہاڑی گاڑنا بھُول گیا۔ ناروے میں ایک پُرانی رسم ہے کہ جب مکان بنانا شروع کیا جاتا ہے تو اُس کی بنیادوں میں کلہاڑی ضرور گاڑی جاتی ہے۔ کُلہاڑی گاڑنے کا یہی مقصد ہوتا ہے کہ اگر اس جگہ چُڑیلیں، بھُوت یا جِن رہتے ہوں تو اگلی صُبح کُلہاڑی غائب ہو گی۔ لوگ اس جگہ مکان نہیں بناتے تھے جہاں سے گڑی ہوئی کُلہاڑی غائب ہو جائے۔ کسان اس رسم کے بارے میں بالکل بھُول گیا اور مکان بنالیا۔ ساتھ ہی دانے بھُوسے کے لیے اناج گھر بھی بنالیا۔ اس اناج گھر میں اناج کے علاوہ مویشیوں کے چارے کے لیے گھاس بھی بھری رہتی تھی۔ سردیوں کے شروع میں گھاس اکٹھّی کرلی جاتی جو سارا سال کام آتی۔

اب کسان کے پاس چار گائیں، دو بھیڑیں اور ایک شان دار گھوڑا تھا۔ اس کے دِن پھرنے لگے۔ بیوی بچّے خُوش تھے۔ پیداوار کافی تھی اور کسان کو اُمّید تھی کہ آیندہ سال فصل پکنے کے بعد اُس کے پاس کافی روپیہ ہو جائے گا۔

موسم گرما ختم ہونے والا تھا۔ کسان کھیتوں میں کام ختم کرکے گھر واپس آرہا تھا اور چلتے چلتے سوچ رہا تھا کہ اگلے سال کھیتوں میں کیا بونا چاہیے۔ کِن چیزوں میں

فائدہ رہے گا اور کِن میں نقصان۔ اس قسم کی باتیں اُس کے ذہن میں چکّر لگا رہی تھیں۔ وہ دِل ہی دِل میں خُوش ہو رہا تھا کہ پیسے ملتے ہی فلاں تُحفہ بیوی کے لیے خریدوں گا اور فُلاں فُلاں شے بچّوں کو دوں گا۔ وہ مزے مزے سے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مکان کی چھت پر بنی ہوئی چمنی سے دھواں نکل رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ بیوی رات کا کھانا تیّار کر رہی ہے۔

اچانک ایک سفید داڑھی والا بھُتنا کسان کے راستے میں آ گیا اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر اناج گھر کی طرف کھینچتا ہوا لے گیا۔ کسان کو اِتنی مُہلت ہی نہ ملی کہ وہ بوڑھے کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھُڑا سکتا۔ وہ حیران تھا کہ یہ بوڑھا کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد کسان اناج گھر کے نیچے تہہ خانے میں کھڑا تھا۔ یہ تہہ خانہ چُڑیلوں اور بھُتنوں کا گھر تھا۔

"دیکھو!" بھُتنے نے گرج کر کہا۔ "دیکھو! غور سے دیکھو! اِدھر دیکھو اور اُدھر بھی۔" اُس نے جگہ جگہ پڑے ہوئے گندے پانی کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ گندہ پانی تُمھارے اناج گھر سے ٹپک رہا ہے۔ اس نے میرے گھر کو اِتنا

گندہ کر دیا ہے کہ یہاں رہنا مُشکل ہو گیا ہے۔ "

پھر کسان کی طرف مُنہ کر کے سفید داڑھی والے بھُتنے نے نفرت سے کہا۔ ”تم نے اپنا مُنّا ہم سے واپس لے لیا۔ ہم نے کُچھ نہیں کہا۔ پھر بڑے بیٹے کو بھی لے گئے ہم خاموش رہے۔ لیکن اب حد ہو گئی ہے۔ “

اگلی صُبح کسان کی آنکھ کھلی تو وہاں کچھ نہ تھا۔ اناج گھر جل کر راکھ کا ڈھیر بن چکا تھا۔

یہاں میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ چُڑیلیں صرف ننّھے مُنّے بچّوں ہی چُرا کر نہیں لے جاتیں۔ وہ بعض اوقات کھانے پینے کی چیزیں بھی چوری کر لیتی ہیں۔ مثلاً دُودھ، دہی، مکھّن، پنیر، چینی، پھل، روٹی۔ غرض جو چیز ہاتھ لگے، لے اُڑتی ہیں۔ میں آپ کو چُڑیلوں کا ایک اور دل چسپ قصّہ سُناتی ہوں۔

ایک دفعہ کوئی کسان اپنے کِسی دوست سے ملنے اس کے گاؤں جا رہا تھا۔ اس گاؤں کا نام تھا جستاد۔ جستاد میں داخل ہونے سے پہلے گھنے جنگل میں سے گُزرنا پڑتا تھا۔ کسان نے آدھا جنگل پار کیا تو لمبے لمبے درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان درختوں کی وجہ سے جنگل میں اندھیرا پھیلا ہُوا تھا۔ کہیں کہیں سُورج کی

روشنی سُنہری دھبّوں کی صُورت میں زمین پر پڑ رہی تھی۔ یکایک کسان کو کسی کی آواز سُنائی دی :

”جلدی جاؤ۔۔۔۔ جلدی جاؤ

آئر کو بتلاؤ اس کا بیٹا جلنے لگا ہے

آئر کو سمجھاؤ

دائیں نہ دیکھو، بائیں نہ دیکھو

سیدھے بھاگتے جاؤ۔“

غریب کسان یہ عجیب الفاظ سُن کر ہکّا بکّا رہ گیا۔ ایسے لگتا تھا کہ آواز کہیں قریب سے آ رہی ہے لیکن سامنے کوئی نظر نہ آتا تھا۔ کسان آگے بڑھتا گیا۔ جستاد پہنچ کر ہی دم لیا۔ سانس پھُولی ہوئی، پسینے میں شرابور خوف سے کانپتا ہوا، عجیب حالت تھی اس کی۔ دوست نے خیریت پُوچھی تو اُس نے جنگل میں پیش آنے والا ماجرا کہہ سُنایا۔ پھر وہ نظم بھی سُنائی:

جلدی جاؤ، جلدی جاؤ

آئر کو بتلاؤ

اس کا بیٹا جلنے لگا ہے

آئر کو سمجھاؤ

دائیں نہ دیکھو، بائیں نہ دیکھو

سیدھے بھاگتے جاؤ۔

جب کسان نے نظم ختم کی تو ساتھ والے کمرے سے دردناک چیخوں کی آواز آئی اور پھر تو کمال ہی ہو گیا۔ اُنھوں نے دیکھا کہ کمرے میں سے ایک چیختی چلّاتی چُڑیل دوڑی آ رہی ہے۔ اپنے دونوں ہاتھوں کو مروڑتی وہ بڑی ہی بھیانک آواز میں رو رہی تھی :

"آہ! آہ! یہ میرا بچّہ ہے۔ میرا بیٹا ہے۔" وہ چلّاتی ہوئی جنگل کی طرف بھاگ گئی۔

لیکن گھبراہٹ میں وہ اپنی چھوٹی سی ٹوپی وہیں بھُول گئی۔ جسے پہن کر وہ لوگوں کی

نظروں سے اوجھل ہو جاتی تھی۔ جب وہ گھر میں داخل ہوئی تھی تو ٹوپی پہنے ہوئے تھی تاکہ کسی کو نظر نہ آئے۔ وہ اس گھر سے کیک، ڈبل روٹی، مکھّن، کریم اور جام وغیرہ چُرانے آئی تھی۔

لیکن جوں ہی اُس نے کسان کی زبانی وہ نظم سُنی، سب کچھ چھوڑ چھاڑ جنگل کو بھاگی۔ نظم میں اُسے پیغام دیا گیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو جلنے سے بچائے۔

دو تین دن بعد کا قصّہ ہے، وہی کسان اپنے کھیت میں کام کر رہا تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اناج گھر میں رکھ دے یا یُوں ہی باہر پڑا رہنے دے۔ اچانک ایک آواز نے اُسے چونکا دیا۔ آواز بالکل اس کے قریب سے آ رہی تھی، مگر سامنے کوئی نظر نہ آتا تھا۔ آواز کہہ رہی تھی۔ "کسان بھائی، اناج اندر لے جاؤ۔ کل موسلا دھار بارش ہو گی۔ "

"بہت اچھّا۔" یہ کہہ کر کسان نے ہر طرف گردن گھُما کر دیکھا کوئی نظر نہ آیا۔ وہ بڑبڑایا۔

"کیسی عجیب بات ہے!"

پھر اُس نے اناج گاڑی میں بھرا اور گھر لے گیا۔ چار پانچ پھیروں میں سارا اناج گھر پہنچ گیا۔ اب سورج غروب ہو گیا۔ اُس نے روٹی کھائی اور پڑ کر سو گیا۔

اگلی صُبح آنکھ کھُلی تو باہر زور کی بارش ہو رہی تھی۔ اتنا پانی برس رہا تھا کہ گلیوں میں ندیاں بہہ رہی تھیں۔ پرنالے شور مچا رہے تھے۔

کھڑکیوں اور روشن دانوں میں سے بوچھاڑ اندر آ رہی تھی۔ دن بھر مینہ اسی زور سے برستا رہا۔ رات ہوئی تو کسان نے اپنے گھر کی کھڑکیاں کھول دیں اور ایک کھڑکی میں کھڑا ہو کر زور سے بولا :

"میرے دوست، شکریہ۔ میرے چھُپے ہوئے مہربان تُمہارا شکریہ۔ میں تُمہارا احسان کبھی نہ بھُولوں گا۔"

کیا خیال ہے؟ اس کی آواز کا کوئی جواب آیا ہو گا؟ کوئی ہنسا ہو گا؟ ہاں ظاہر ہے تیز ہوا اور بارش کا شور تھا لیکن یہی ہوا اور بارش آئر چُڑیل کا پیغام لائی تھی۔ وہ کسان کی شُکر گزار تھی کہ اُس نے وقت پر اُس کے بیٹے کی خبر اُسے پہنچا دی تھی، ورنہ وہ سچ مُچ جل مرتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ چُڑیلیں اچھّی بھی ہوتی ہیں۔

بھُوت کی آنکھ

جنگلی بھُتنے پہاڑی بھُتنوں سے مُختلف ہوتے ہیں۔ پہاڑی بھُتنے اِنسانوں کو بہت تنگ کرتے ہیں۔ بچّوں کو چُرا کر لے جاتے ہیں اور ان سے سخت کام لیتے ہیں۔ مارتے پیٹتے بھی ہیں۔ جنگلی بھُتنے ایسے نہیں ہوتے۔ وہ اچھّے دِل کے ہوتے ہیں۔

جب آپ ناروے کے سرسبز پہاڑوں کی سیر کرتے ہوئے اُونچی چوٹیوں پر پہنچ جائیں تو وہاں گھنے جنگل شروع ہو جاتے ہیں۔ چیڑ کے اُونچے اُونچے درخت اور دُور دُور تک پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے نیچے دِن کے وقت بھی اندھیرا رہتا ہے۔ اِن درختوں کے نیچے گھنے جھنڈوں میں، عام طور پر گیڈر، خرگوش اور دوسرے جنگلی جانور رہتے ہیں۔ یہاں چلتے چلتے آپ کی ملاقات

چُڑیل سے بھی ہُو سکتی ہے۔ یہیں کہیں آپ کو کوئی نیک دِل بھُتنا بھی مل جائے گا۔ جنگلی بھُتنا ہوتا ہی بڑا ہے۔ لیکن پہاڑی بھُتنے جتنا ہیبت ناک نہیں ہوتا۔ خاص بات یہ ہوتی ہے کہ اس کا ایک ہی سر ہُوتا ہے اور میری اور آپ کی طرح دو آنکھیں ہُوتی ہیں۔ بعض بھُتنوں کی دو کے بجائے ایک ہی آنکھ ہُوتی ہے۔

جنگلی بھُتنے مزاج کے بُرے نہیں ہُوتے، پھر بھی کوئی نہ کوئی ایسا ضرُور نِکل آتا ہے جو ظالم، بدمزاج اور ہیبت ناک ہُوتا ہے۔ ہم اِنسانوں میں بھی تو بعض لوگ بُرے اور ظالم ہُوتے ہیں۔ ہماری طرح وُہ بھی ہیں۔ کوئی اچھّا، کوئی بُرا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کِسی گاؤں میں ایک چھوٹا سا لڑکا رہتا تھا۔ اس کا نام پرل تھا۔ پرل بے چارہ غریب تھا، اس کے ماں اور باپ دونوں مر چُکے تھے۔

پُرانے زمانے میں ناروے کے لوگ یتیم بچّوں سے اچھّا سلوک نہیں کرتے تھے۔ وہ بچّے جن کے ماں باپ نہیں ہوتے ان کے پاس رہنے کو گھر نہیں ہوتا تھا اور وہ کسانوں کے کھیتوں میں کام کرتے۔ وہ کبھی کسی کسان کے پاس رہتے اور کبھی کسی اور کے پاس۔ بعض لوگ یتیم بچّوں پر مہربانی بھی کرتے، لیکن زیادہ تر

ظُلم ہی کرتے تھے۔ اُن سے دِن رات کام لیتے اور کھانے کو بہت کم دیتے اور پھر جب چاہے اُن کو گھر سے نکال دیتے۔

بے چارے پرل کا بھی یہی حال تھا۔ وہ جس کسان کے پاس نوکری کرتا، وہ اس سے سخت کام لیتا۔ اُس کو یوں لگتا کہ یہ اس کا اپنا گھر نہیں، بلکہ اس کا گھر کہیں ہے ہی نہیں۔ لوگ اُس کو صرف اس لیے کھانا اور پناہ دے دیتے ہیں کہ وہ اُن کے لیے کام کرتا ہے۔ اس سے پیار کرنے والا کوئی نہیں۔

ایک دفعہ گرمیوں کے دِنوں میں، جب پرل کی عُمر کوئی آٹھ نو برس کی تھی، وہ ایک ایسے ہی کسان کے ساتھ کام کر رہا تھا، اس کی بیوی بڑی ظالم تھی۔ پرل غریب صُبح سے آدھی رات تک کام میں لگا رہتا مگر وہ عورت بھی خوش نہ ہوتی۔ کبھی شاباش نہ دیتی بلکہ اُلٹی گالیاں دیتی۔ اپنے شوہر سے اس کی شکایتیں کرتی اور ہر وقت بُرا بھلا کہتی رہتی۔

"کبھی کہتی کہ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاؤ۔ تُم تو نِرے نکمّے ہو۔"

کبھی کہتی۔ "آج کل گائیں پتلا دُودھ دینے لگی ہیں۔ تُم ان کی ٹھیک طرح دیکھ

بھال نہیں کرتے۔ اور بے وقوف، ذرا انڈوں کو تو دیکھو کیسے چھوٹے چھوٹے ہیں۔ مُرغیوں کو پورا دانہ نہیں ملتا، اس لیے۔ پُورا دانہ کیوں نہیں ڈالتے مرغیوں کو؟ جاؤ، کنویں سے پانی لے کر آؤ۔ ارے! فرش پر پانی گرا دیا، دفع ہو جاؤ۔ صاف کرو فرش کو۔ کام کے نہ کاج کے، دُشمن اناج کے۔"

صُبح سے رات تک وہ اسی طرح ڈانٹتی رہتی۔ آخر پرل اس زندگی سے تنگ آ گیا۔ اب وہ یہاں رہنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک دن صُبح صُبح جب کہ لوگ سو کر بھی نہیں اُٹھتے تھے، وُہ چُپکے سے گھر سے نِکلا اور سیدھا گھنے جنگل کی طرف چلا گیا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا لکڑی کا ڈول تھا۔ اس ڈول میں اس نے جنگلی رس بھریاں بھر لی تھیں تا کہ جب بھُوک لگے تو کھا لے۔

چلتے چلتے رات ہو گئی تو وہ ایک بڑے پتھّر کے نیچے جگہ بنا کر لیٹ گیا۔ اب یہ اُس کا ہر روز کا معمُول تھا کسی پُرانے درخت کی کھوہ میں جنگلی گھاس اکٹھی کر کے بستر بنا لیتا اور مزے کی نیند سو جاتا۔ اس کے چھُپنے کی جگہ کا عِلم صرف بُوڑھے اُلّو کو ہوتا تھا، یا وہ پرندے اس کے بارے میں جانتے تھے جو دن کے بجائے رات کو باہر

نکلتے ہیں۔

پرل کو ناروے کے خُوب صُورت جنگلوں میں گھومتے کئی دن گُزر گئے۔ اس کو یہ خُوشی تھی کہ وہ آزاد ہے۔ کوئی اُسے ڈانٹنے والا نہیں، وہ اپنی مرضی کا آپ مالک ہے۔ جہاں چاہے جا سکتا ہے۔ جی چاہے تو سوتا ہے۔ جی چاہے تو جاگتا ہے۔ اگرچہ وہ اس زندگی سے بہت خُوش تھا مگر بعض وقت تنہائی کی وجہ سے اُداس ہو جاتا تھا۔

جنگل میں اس کے سوا کوئی انسان نہ تھا جس سے وہ بات کرے یا کھیلے۔ بس چیڑ کے لمبے لمبے درخت تھے۔ چڑیاں تھیں، پرندے تھے، گیڈر اور خرگوش تھے جو اُس کی زبان بالکل نہیں سمجھتے تھے۔

ایک شام پرل جنگل میں گھُوم رہا تھا۔ سُورج کی کرنیں درختوں میں سے چھَن چھَن کر آ رہی تھیں۔ اچانک وہ ایک کھُلی جگہ پر پہنچا۔ یہاں اس نے دیکھا کہ ایک جنگلی بھُتنا پتھر کا سہارا لیے نرم نرم گھاس پر گرم گرم دھوپ میں سو رہا ہے۔ وہ خرّاٹے لے رہا تھا۔ پرل کا دل دھک سے رہ گیا۔ رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

سر

سے پاؤں تک تھر تھر کانپنے لگا۔ اس کے ہاتھ سے لکڑی کا ڈول بھی چھوٹ گیا۔

ساری رس بھریاں گر گئیں۔ پھر اُس نے سوچا وہ بھُتنے کے جاگنے سے پہلے ہی دبے پاؤں بھاگ جائے یہ سوچ کر اُس نے اس قدم اُٹھایا۔ دوسرا اُٹھانے ہی والا تھا کہ ایک گرج دار آواز آئی:

"ننّھے لڑکے! ٹھہر جاؤ! مت جاؤ، پیارے بچّے۔"

اگرچہ یہ آواز بہت بھاری تھی، لیکن اس میں محبّت اور نرمی تھی۔ پرل فوراً رُک گیا اور مُڑ کر دیکھا۔ جنگلی بھُتنا اپنے موٹے موٹے، نیلے ہونٹوں سے مُسکرا رہا تھا۔ اس کی مُسکراہٹ میں دوستی تھی۔ بھُتنے نے اُسے اشارہ کیا اور کہا:

"اِدھر آؤ بیٹا۔ ڈرو نہیں۔ کیا ہم دوست نہیں بن سکتے؟ میں اور تُم۔ ٹھیک ہے نا؟ بیٹا، میں بالکل اکیلا ہوں۔ میرا کوئی دوست نہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے سب مُجھ سے ڈرتے ہیں۔"

یہ سُن کر پرل کو بوڑھے بھُتنے پر ترس آ گیا۔ وہ کُچھ دیر جھجکا، پھر بھُتنے کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ بھُتنے نے پیار سے اُسے گُود میں لے لیا۔ اب دونوں مزے مزے کی باتیں کر رہے تھے۔ ہنس رہے تھے جیسے بڑے پُرانے دوست ہوں۔ "میں بہت

بُوڑھا ہو گیا ہوں۔" بھُتنے نے پرل کو بتایا "اب تو بیٹا، مُجھے اچھّی طرح دکھائی بھی نہیں دیتا۔"

پرل نے یہ پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ بھُتنے کی ایک ہی آنکھ ہے۔ اُسے یہ بھی معلُوم تھا کہ بھُتنے جب چاہیں اپنی آنکھ باہر نکال سکتے ہیں۔ اُنہیں کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ اس نے بھُتنے سے کہا:

"بڑے میاں، ذرا آنکھ نکال کر مُجھے دکھایئے۔ دیکھوں تو سہی اس میں کیا گڑبڑ ہے۔"

بھُتنے نے فوراً آنکھ نکال کر پرل کو دے دی۔ یہ آنکھ پرل کے سر جتنی بڑی تھی۔

"اچھا۔۔۔!" پرل نے آنکھ کو اچھّی طرح دیکھ بھال کر کہا۔ "بڑے میاں، آپ کو صاف کیسے نظر آئے، آنکھ میں تو تنکے اور کنکر پتھّر پڑے ہوئے ہیں اور اس کے اُوپر پھپھوندی بھی آ گئی ہے۔"

پرل نے اِحتیاط سے آنکھ میں سے ایک ایک کر کے تنکے چُنے، پتھّر نکالے،

پھپھوندی کو کھُرچ کر آنکھ کا شیشہ صاف کیا۔ پھر قریب بہتے ہوئے چشمے پر گیا اور اُس میں آنکھ کو دھو کر خوب چمکایا۔ جب آنکھ شفاف آئینے کی طرح چمک اُٹھی تو بھُتنے کو دیتے ہوئے بولا: "لو بڑے میاں، اب لگا کر دیکھو۔"

بھُتنے نے آنکھ ماتھے کے درمیان میں اس جگہ پھنسالی جہاں سے نکالی تھی۔ پھر کھی کھی کرتا ہوا بولا:

"واہ وا! مزا آگیا، اب تو مجُھے بالکل ویسا ہی نظر آتا ہے جیسا آج سے دو سو سال پہلے نظر آتا تھا۔"

پرل ہکّا بکّا رہ گیا۔ اُس نے پُوچھا۔ "دو سو سال پہلے بڑے میاں؟ آپ کی عُمر کتنی ہے؟"

"مجُھے اپنی عُمر اچھی طرح یاد نہیں۔" بڑے میاں نے جواب دیا۔ "ہاں اتنا جانتا ہوں کہ میں کم از کم تین ہزار سال کا ہوں۔"

پرل حیرت سے بُوڑھے میاں کا مُنہ تکنے لگا۔ پھر کُچھ سوچ کر بولا:

”پھر تو بڑے میاں، آپ اِتنے پُرانے ہیں جتنا ہمارا ناروے۔ “

اس پر بُوڑھے بھُتنے نے زور کا قہقہہ لگایا۔ اس کے قہقہے سے اِرد گرد کے پہاڑ گُونج اُٹھے۔ پرل کو ایسے لگا جیسے دُور کہیں بادل گرج رہا ہے۔

اُونچے پہاڑوں کے پیچھے ڈوبتے ہوئے سُورج کو دیکھتے ہوئے بھُتنے نے پرل کو بتایا:

”ننّھے ساتھی، سورج غروب ہونے والا ہے۔ چند لمحوں میں رات ہو جائے گی۔ آؤ ہم رات کے کھانے کے لیے دریا سے کُچھ مچھلیاں پکڑ لیں۔ مُجھے معلوم ہے دریا کہاں ہے۔“ پھر اُس نے اُونچی گھاٹیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

”ان گھاٹیوں کے اس پار دریا ہے۔ اس دریا میں ناروے کی سب سے اچھّی مچھلیاں ملتی ہیں۔ جب سورج ڈوبنے لگتا ہے اور مکھّیاں اور مچھّر پانی کے اوپر منڈلاتے ہیں تو مچھلیاں اُنہیں پکڑنے کے لیے نِکلتی ہیں۔ بس یہی وقت ہوتا ہے اُن کو پکڑنے کا۔“

”مگر ہم تو دو دِن بھی چلتے رہے تب بھی وہاں نہیں پہنچ سکتے۔“ پرل نے اندازہ لگا

کر کہا۔

"نہیں۔ اِتنا وقت نہیں لگے گا۔" بھُتنا ہنسا۔ "تم صِرف اِتنا کرو کہ میرے کندھوں پر سوار ہو جاؤ اور مُجھے مضبُوطی سے پکڑے رکھو۔"

"بہت اچھّا؟" کہہ کر پرل بھُتنے کے کاندھوں پر سوار ہو گیا۔

بھُتنا ہولے سے اُٹھا۔ پرل اُوپر ہی اُوپر جا رہا تھا۔ پھر اُسے یوں لگا جیسے وہ پہاڑ کی چوٹی پر ہو۔ اُس کا بھُتنا دُوست اِتنا لمبا تھا۔

"تیّار ہو؟" بھُتنے نے پرل سے پُوچھا۔

"جی ہاں۔ تیّار ہوں۔" پرل نے جواب دیا۔

"اچھّا، ٹھیک ہے۔ زور سے پکڑے رکھنا۔ میں چلنے لگا ہوں۔"

پھر وہ چلنے لگا۔ ایک ہی قدم میں پورا پہاڑ گُزر گیا جو ایک لمحہ پہلے میلوں دُور نظر آتا تھا۔ نیلا آسمان، بادلوں کے ٹکڑے، گھاٹیاں، درخت، جھیلیں، آبشار، چشمے ہر چیز کے پاس سے وہ شُوں کر کے گُزر جاتے۔ پرل بے چارہ حیران تھا۔ اُسے

ایسے لگتا تھا جیسے وہ سانس لینا بھُول گیا ہو۔

ایک منٹ بعد وہ پہاڑیوں کے پار، ایک خُوب صُورت ہری بھری وادی میں کھڑے تھے۔ اس وادی کے عین درمیان سے دریا گُزرتا تھا۔ پرل کو جب کُچھ ہوش آیا تو اس نے کہا:

"مُجھے معلُوم نہ تھا کہ کوئی اِتنا تیز بھی دوڑ سکتا ہے۔ میرے لیے تو یہ بڑے اچنبھے کی بات ہے۔ اور ہاں! کھانے کا کیا کِیا تُم نے؟" صرف پانچ منٹ کی دیر ہے۔ کھانا تیّار سمجھو۔"

یہ کہہ کر بُوڑھا بھوت دریا کے کنارے پر جھک گیا جہاں چاندی کے رنگ کی بڑی بڑی مچھلیاں اُچھل اُچھل کر کیڑے مکوڑے سے پکڑ رہی تھیں۔ اس عرصے میں پرل نے بہت ہی میٹھی رسیلی رس بھریاں اکٹھی کر لیں۔ یہ رس بھریاں اِتنی میٹھی اور رسیلی تھیں کہ پرل نے آج تک نہیں کھائی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد یہ دونوں کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ پرل نے ایسا کھانا زندگی بھر نہیں کھایا تھا۔

رات ہوئی تو بھُوت نے ایک صاف سُتھرے غار میں خُوش بُودار گھاس بچھا دی تا کہ پرل آرام سے سو جائے۔ پھر آپ بھی پرل کے قریب ہی بڑے سے پتھّر پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ پرل کو آج تک نہ تو ایسا بستر ملا تھا اور نہ کسی نے اُس سے اِتنا پیار ہی کیا تھا۔ وہ نیک دل بھُوت کے بارے میں سوچتا میٹھی نیند سو گیا۔

پرل اور بھُوت اب اکٹھّے رہنے لگے۔ بھُوت نے پرل کو مچھلیاں پکڑنا سکھا دیا اور یہ بھی سمجھا دیا کہ بڑی مچھلیاں کہاں ہوتی ہیں۔ اچھّی پکی ہوئی رس بھریاں کہاں ملتی ہیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ رات کو سونے اور آرام کرنے کے لیے کون سی

جگہیں نرم اور گرم ہیں۔ اس نے پرل کو ستاروں کا عِلم بھی سِکھایا۔ غرض بُوڑھا بھُوت جو کُچھ جانتا تھا، سب کُچھ پرل کو بتا دیا۔ وہ محبّت سے سکھاتا تھا اور پرل شوق سے سیکھتا تھا۔

پھر سردیاں آ گئیں اور ٹھنڈی برفیلی ہوائیں چلنے لگیں پہاڑوں پر دُھند کی موٹی چادر بچھ گئی۔ درخت، پہاڑ، وادیاں اور میدان اس چادر کے نیچے دُبک کر گہری نیند سو گئے۔ ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ پرندوں نے گانا بند کر دیا۔ آبشار ہولے ہولے بولنے لگے۔ ایسے موسم میں بھُوت پرل کو ایک بہت بڑے پہاڑ پر لے گیا۔

پہاڑ پر پہنچ کر بھُوت نے جیب میں سے چابی نِکالی۔ یہ چابی پرل سے دوگنی بڑی تھی۔ پھر اُس چابی کو ایک غار کے مُنہ میں ڈال دیا۔ اصل میں غار کا مُنہ نہ تھا بلکہ ایک بہت بڑے تالے کا سوراخ تھا۔ بھُوت نے چابی گھُمائی تو ایک گڑگڑاہٹ سے پتھّر کا بنا ہوا بڑا سا دروازہ کھُل گیا۔ اب پرل کو ایک تاریک راستہ نظر آیا۔ اس نے بھُوت سے پُوچھا:

"بڑے میاں، یہ راستہ کہاں جاتا ہے؟"

"میرے ساتھ آؤ، بیٹا۔ میں تُمھیں دِکھاتا ہوں۔"

پرل کُود کر بھُوت کی ہتھیلی پر بیٹھ گیا۔ وہ حیرت سے سانس روکے ہوئے تھا۔ بھُوت اُسے ہاتھ پر اُٹھائے چلتا رہا اور پھر ایک بڑے سے کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کمرے کی دیواریں چاندی کی بنی ہوئی تھیں، فرش اور چھت بھی چاندی کی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کمرے میں چاندنی بکھری ہوئی ہے۔

"کیا خُوب صُورت کمرا ہے!" پرل نے حیرت سے کہا۔

"ذرا ٹھہرو۔" بھُوت نے کہا اور پرل کو ساتھ لیے اُس کمرے سے نِکل کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ یہ کمرا بھی اُتنا ہی لمبا چوڑا تھا۔ یہاں ایسا لگتا تھا جیسے سورج چمک رہا ہے۔ دُھوپ پھیلی ہوتی ہے۔ اس کمرے کا فرش، چھت اور دیواریں سونے کی تھیں۔

"واہ!" پرل نے کمرے کو چاروں طرف نظریں گھُما کر دیکھا۔

"ابھی ٹھہرو۔" یہ کہہ کر بھُتنا پرل کو ہتھیلی پر بٹھائے تیسرے کمرے میں داخل ہوا۔ یہاں آ کر پرل آنکھیں جھپکنے لگا۔ کیوں کہ کمرے میں بڑی تیز روشنی ہو رہی تھی۔ یہ کمرا سارے کا سارا ہیروں کا بنا ہوا تھا۔

"کتنا شان دار ہے!" پرل نے مُنہ ہی مُنہ میں کہا۔

کمرے کی چمک دمک اور شان و شوکت نے اُسے حیران کر دیا تھا۔ اس نے بے ساختہ پُوچھا:

"یہاں کون رہتا ہے؟"

بھُوت نے بتایا۔ "کسی زمانے میں ان کمروں کو بھُوتوں کا بادشاہ اِستعمال کرتا تھا، لیکن اب وہ اس پہاڑ کی دوسری طرف رہنے لگا ہے۔ اس لیے یہ کمرے خالی پڑے ہیں۔ جب سردیاں آتی ہیں اور برف گرنے لگتی ہے تو میں یہاں آ جاتا ہوں اور بہار آنے تک یہیں رہتا ہوں۔"

بھُوت نے پرل کو بھُوتوں کے شاہی محل کی سیر کرائی۔ پھر ایک چھوٹے سے

کمرے میں لے گیا جس میں جلانے کی لکڑیاں بھری ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں بہت بڑا آتش دان تھا۔

بھُوت اور پرل سردیاں گزارنے کے لیے اس کمرے میں رہنے لگے۔ کمرا گرم اور آرام دہ تھی۔ وہ آتش دان میں لکڑیاں جلا کر لال شُعلوں کی روشنی میں بیٹھے گھنٹوں باتیں کرتے۔ کسی دن جب دُھند نہ ہوتی اور دھوپ نکل آئی تو وہ غار کے سامنے والے پتھّر کے بھاری دروازے کو کھول کر باہر نکل آتے۔ پہاڑوں پر برف جمی ہوتی اور لوگ اس پر پھسلنے کا کھیل کھیل رہے ہوتے۔ پھسلنے والے زُوں کرتے اُن کے پاس سے گُزر جاتے اور اُن کے پیچھے بنے اُن کے لکڑی کے بنے ہوئے جُوتوں سے برف پر لمبی لکیریں بن جاتیں۔

ایک روز بھُوت نے پرل کے لیے بھی برف پر پھسلنے والے جُوتے تیّار کیے تا کہ وہ بھی برف پر چلے اور اُس کے جسم میں نیا اور تازہ خون دوڑنے لگے۔ وہ بھی تن درست اور صحت مند ہو جائے جیسے دوسرے کھیلنے کُودنے والے بچّے صحت مند ہوتے ہیں۔ بھُوت پرل کو تن درُست اور ہنستا کھیلتا دیکھنا چاہتا تھا۔

"بڑے میاں، اب میں آپ کے ساتھ دوڑ سکوں گا۔ مگر آپ ذرا آہستہ چلیے گا۔" پرل نے نئے جوتے پہن کر ایک ٹیلے سے دوسرے ٹیلے پر چھلانگ لگا کر کہا۔

وہ ہنس رہا تھا، قہقہے لگا رہا تھا اور برف پر سے پھسلتا ہوا جا رہا تھا۔ جب وہ ایک پہاڑی سے دوسری پر کُودتا تو بھُتنا اُسے اپنے ہاتھوں میں دبوچ لیتا تاکہ اس کو چوٹ نہ لگے۔

آپ کبھی برف پر پھسلنے کے لیے ناروے کے پہاڑوں پر جائیں تو آپ کو برف پر لمبی دھاریاں سی نظر آئیں گی۔ ان دھاریوں کے ساتھ برف میں بڑے بڑے گڑھے بھی دکھائی دیں گے۔ ہر دو تین میل کے فاصلے پر یہ نشان ملیں تو سمجھ جائیں کہ یہ پرل کے لکڑی کے جوتوں کے نشان ہیں اور بھُوت کے پاؤں سے بنے ہُوئے گڑھے ہیں۔

ناروے میں سردیوں کی راتیں لمبی اور اندھیری ہوتی ہیں۔ وقت گزارنے کے لیے بھُوت پرل کو کہانیاں سناتا تھا۔ پُرانے زمانے کے جوتوں اور انسانوں کی کہانیاں، پریوں اور جنوں کی کہانیاں، بادشاہوں، شہزادوں اور شہزادیوں کی

کہانیاں۔ بھُوت خود تین ہزار سال کا تھا اس لیے اُسے بہت سی کہانیاں یاد تھیں۔

پرل کو ان میں سے ایک کہانی بے حد پسند تھی۔ وہ اپنے بھُوت دوست سے بار بار وہی کہانی سُنانے کی فرمائش کرتا۔ میں آپ کو بھی وہ کہانی سُنا دیتی ہوں جو پرل کو پسند تھی اور وہ بھُوت سے بار بار سُنا کرتا تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے، کسی گاؤں کے باہر تین چھوٹے چھوٹے لڑکے کھیل رہے تھے۔ بڑے کا نام تھاٹور، منجھلے کا جون اور سب سے چھوٹے کا اول تھا۔ یہ تینوں اپنی بیوہ ماں کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کا گھر جنگل کے سِرے پر تھا۔ باپ مر چکا تھا اس لیے کمانے والا کوئی نہ تھا۔ ماں بے چاری محنت مزدوری کر کے مُشکل سے بچّوں کا پیٹ پالتی تھی۔ بعض دِن ماں اور بیٹے سارا سارا دِن جنگل سے لکڑیاں چُنتے تب کہیں جا کر رات کا کھانا کھا سکتے۔

ایک روز ماں نے تینوں بیٹیوں کو پڑوس کے ایک گاؤں میں بھیجا تا کہ وہ دُودھ اور انڈے لے آئیں۔ اس نے لڑکوں سے کہا کہ واپسی پر جنگل سے لکڑیاں اور رس

بھریاں بھی لیتے آنا۔ یہ گاؤں کافی دُور تھا اور وہاں تک پہنچنے کے لئے کئی میل چلنا پڑتا تھا۔ ٹور، جون اور اول صُبح ہی صُبح چل پڑے اور دوپہر تک اس گاؤں میں پہنچ گئے۔

ماں نے جس کسان کے پاس اپنے بچّوں کو بھیجا تھا، اس کی بیوی بڑی نیک دل تھی۔ اس نے لڑکوں کو ایک بڑا سا کیک اور گاڑھا گرم دُودھ دیا۔ کُچھ دیر تو تینوں بھائی کھیتوں میں کھیلتے رہے۔ پھر انڈے اور دُودھ لے کر سہ پہر کے وقت گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ جنگل کی جھاڑیاں پکی ہوئی رس بھریوں سے لدی ہوئی تھیں۔ بچّے رس بھریاں توڑ توڑ کر اپنے ڈولوں میں بھرنے لگے۔

رس بھریاں توڑنے اور باتیں کرتے اندھیرا ہو گیا۔ ٹور نے بھائیوں سے کہا:

"میرا خیال ہے، اب ہمیں گھر جانا چاہیے۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔ جلدی گھر نہ پہنچے تو ماں پریشان ہو گی۔"

ٹور یہ کہہ ہی رہا تھا کہ دُور سے عجیب سا شور سُنائی دیا۔ پہلے تو گڑ گڑاہٹ ہوئی، پھر دھماکہ ہُوا پھر ایک اور دھماکا ہُوا۔ پھر ایک اور۔ اس کے ساتھ ہی سُورج آہستہ

سے گھاٹیوں کے پیچھے ڈُبکی لگا گیا۔ اندھیرا بڑھنے لگا۔ گڑگڑاہٹ اور دھماکے بڑھتے جا رہے تھے۔ اب یہ شور قریب آنے لگا تھا۔ کڑڑ دھم۔۔۔ کڑڑ دھم۔۔۔ ایسا لگتا تھا جیسے بڑے بڑے درخت ٹوٹ کر ِگر رہے ہوں اور کوئی دیو ہر چیز کو لتاڑتا چلا آرہا ہو۔ ٹور، جون اور اول ایک ساتھ چلّائے:

"دیکھو!"

تینوں نے ایک ہی طرف اشارہ کیا۔ یہ چیز کیا تھی؟ سمجھ لیجیے ایک موٹا سا درخت تیزی سے ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پھر ایک زبردست دھماکا ہوا۔ یہ دھماکا ان کے بالکل قریب ہوا تھا۔ درختوں کے ڈال ٹوٹنے اور شاخیں چٹخنے کی آوازیں بھی بڑھ رہی تھیں۔ ساتھ ہی کسی کے چیخنے اور دھاڑنے کی ہولناک آواز سُنائی دی، جیسے کوئی شخص درد سے بلبلا رہا ہو۔

اچانک، چلتے ہوئے درخت کا تنا رُک گیا۔ تینوں بھائیوں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ ارے! یہ تو کسی دیو کی ٹانگ تھی، پھر اُنھوں نے گردن اُٹھا کر اُوپر دیکھا۔ ان کے سامنے بہت بڑا جنگلی دیو کھڑا تھا۔ خوف سے اُن کے پاؤں دو دو من کے ہو گئے۔

دوڑنا چاہتے تھے لیکن دوڑ نہ سکتے تھے۔ جہاں تھے، وہیں کھڑے رہے۔

دیو نے دوسرا قدم اُٹھایا تو پھر ویسا ہی شور ہُوا۔ اب لڑکوں کو دیو کی دوسری ٹانگ بھی نظر آ گئی۔ اُس کا یہ پاؤں صنوبر کے لمبے درخت پر پڑا تھا۔ بے چارے درخت کا چُورا ہو گیا۔ دیو زور سے دہاڑا۔ وہ ٹٹول ٹٹول کر چل رہا تھا۔ تینوں بھائی حیرت سے دیکھنے لگے۔ اُنہیں دیو کے ہائے ہائے کر کے رونے پر ہنسی آ گئی۔

"کون ہنس رہا ہے؟" دیو گرج کر بولا۔

لڑکوں نے سانس رُوک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"اِدھر کوئی ہے؟" دیو نے پوچھا۔

"ہاں۔ ہم ہیں۔ کیا ہم تُمہیں نظر آتے؟" اول نے کہا۔

"نہیں۔ بالکل نہیں۔ اگر میں دیکھ سکتا تو پُوچھتا کیوں۔" دیو نے کہا۔ "میں اندھا ہوں۔"

یہ کہہ کر اُس نے قدم اُٹھایا اور پھر نیچے رکھا تو ایک چٹّان لُڑھک گئی۔ لڑکوں کو جب یہ پتا چلا کہ دیو اندھا ہے تو اُنہیں بڑا افسوس ہوا۔ ہائے ہائے! اسی لیے وہ ٹھوکریں کھا رہا تھا۔ کبھی اُدھر جاتا، کبھی اِدھر۔ درخت اور چٹانیں اُس کے

پاؤں تلے آکر ٹوٹ رہی تھیں اور یہ اُنہی کا شور تھا۔ اول، جو تینوں بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا، زور سے چیختا تاکہ دیو کے کان تک آواز پہنچ جائے۔

"تُمہاری آنکھ کہاں کھو گئی ہے؟"

"اسی جنگل میں کہیں گر گئی ہے۔ آج دوپہر اس میں تِنکا پڑ گیا تھا، میں نے سوچا، نکال دوں۔ نکالنے لگا تو آنکھ ہاتھ سے چھُوٹ گئی۔"

"اوہو! چچ چچ! بے چارہ!" اول کو اُس پر ترس آ گیا۔ "تم یہاں بیٹھو۔ ہم آنکھ تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ابھی دیکھ لیں تو اچھّا ہے۔ تھوڑی دیر بعد تو کُچھ بھی نظر نہیں آئے گا۔"

"تم کتنے رحم دل ہو۔" دیو نے جواب دیا۔ اُسے یہ نیک لڑکے بہت اچھّے لگے۔ پھر اس نے ٹٹول ٹٹول کر بیٹھنے کے لیے تھوڑی سی جگہ تلاش کر لی۔ وہ تو ایک بڑے سے پتھّر کا سہارا لے کر بیٹھ گیا اور لڑکے آنکھ تلاش کرنے لگے۔

ٹُور نے بھائیوں سے کہا۔ "آنکھ بہت بڑی ہو گی۔"

"ہاں۔ بڑی ہو گی۔ اور آسانی سے مل جائے گی۔" جون نے جواب دیا۔

تینوں لڑکے جنگل کے کونوں کھُدروں میں آنکھ تلاش کرنے لگے۔ اول دونوں بھائیوں سے ذرا دُور نِکل گیا تھا۔ وہ وہیں سے پُکار کر بولا:

"آہا! اِدھر آؤ۔ مِل گئی۔ آنکھ مِل گئی۔"

ٹور اور جون اول کی طرف بھاگے۔ وہاں سچ مُچ ایک بڑی سی چمک دار سی چیز ایک کھائی میں پڑی تھی۔ وہ شُتر مُرغ کے انڈے کے برابر ہو گی۔ یہ آنکھ جھپک ہی تھی اور گھُور بھی رہی تھی۔ اول نے اُسے اٹھایا تو وہ کافی بھاری تھی۔

اب رات ہو چکی تھی۔ اول ہولے ہولے چل رہا تھا کہ کہیں پاؤں نہ رپٹ جائے اور آنکھ گِر جائے۔ جب تینوں بھائی بُوڑھے دیو کے پاس پُہنچے تو اول نے چیخ کر کہا:

"یہ لو۔ تُمہاری آنکھ مل گئی ہے۔"

بُوڑھے دیو کو بہت خوشی ہوئی۔ اس نے جلدی سے آنکھ اپنے ماتھے پر لگائی۔ پھر اُس نے کہا:

"اب میں تُمھیں دیکھ سکوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ جھکا، کیوں کہ چھوٹے چھوٹے لڑکوں کو وہ جھکے بغیر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ویسے بھی رات کا وقت تھا۔ دیو تھا تو خُوف ناک مگر لڑکے اس سے ذرا بھی نہیں ڈرے۔ وہ اُن کے ساتھ دوستوں کی طرح پیش آ رہا تھا۔ وہ ہنس کر بولا:

"ارے واہ! تین ننّھے مُنّے لڑکے۔ بولو، تم میں اول کون ہے؟"

تینوں نے اپنا اپنا نام بتایا۔ جب وہ بتا چُکے تو دیو نے کہا۔

"اچھا، اب مُجھے یہ بتا دو کہ تم رہتے کہاں ہو؟ میں تو یہ جانتا ہوں کہ ننّھے مُنّے لڑکے رات کو دیر تک باہر نہیں گھومتے کیوں کہ اُن کے ماں باپ پریشان ہوتے ہیں۔"

لڑکوں نے بتایا کہ وہ کہاں رہتے ہیں تو اُس نے کہا۔ "اچھا، اب تم میرے کندھوں پر سوار ہو جاؤ۔ میں تُمھیں گھر پہنچا دوں گا۔ تُمھاری ماں تو پریشان ہو رہی ہو گی کہ میرے بچّے کہاں گئے۔ آؤ، شاباش! بیٹھو میرے کندھوں پر۔"

"بہت بہت شکریہ۔" ٹور بولا۔

جون اور اول نے بھی شکریہ ادا کیا اور پھر تینوں بھائی دیو کے چوڑے کندھوں پر بیٹھ گئے۔

ٹور اور جون ایک کندھے پر جم گئے تو دیو ان کے گھر کی طرف چلا اور دو یا تین قدموں میں پورا جنگل پار کر گیا۔ پلک جھپکتے میں بچّے اپنے گھر کے دروازے کے سامنے تھے۔ بوڑھے دیو نے تینوں کو ایک ایک کر کے زمین پر کھڑا کر دیا اور اِس سے پہلے کہ اُن کا شکریہ ادا کرتے، وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

تینوں بھائی بھاگتے ہوئے گھر کے اندر داخل ہوئے تا کہ ماں کو یہ عجیب کہانی سُنائیں۔ ماں کو بیٹوں کی بات پر یقین نہیں آتا تھا۔ وہ بار بار پُوچھتی تھی:

"بیٹا، تم ڈرے تو نہیں؟ تُمھیں دیو نے کُچھ کہا تو نہیں؟ اتنی دیر کیوں لگائی تم نے؟" ماں پُوچھے جاتی تھی۔ بیٹے جواب دیے جاتے تھے۔

اگر ماں کو کوئی شک تھا تو وہ دوسری صُبح دُور ہو گیا جب سارا خاندان ناشتے کے لیے

بیٹھا تو اول نے باہر والا دروازہ کھُولا تا کہ لکڑیوں کے گودام میں سے جلانے کے لیے لکڑیاں لے آئے۔ دروازہ کھولتے ہی اُس کی نظر دو بوریوں پر پڑی۔ ایک بوری دروازے کے دائیں طرف پڑی تھی اور دوسری بائیں طرف۔ اول حیران تھا کہ یہ بوریاں یہاں کون رکھ گیا؟ اس سے پہلے ایک بوری کا مُنہ کھولا۔ اس میں چاندی بھری ہوئی تھی۔

"ماں، ماں! باہر آؤ جلدی سے۔" اول نے ماں کو پُکارا۔

سب دوڑے دوڑے جھونپڑی سے باہر گئے۔ اس وقت تک اول دوسری بوری بھی کھول چکا تھا۔ اس میں سونا بھرا ہوا تھا۔ سب آنکھیں پھاڑے بوریوں کو دیکھ رہے تھے کہ اچانک ان کی نظر ایک کاغذ پر پڑی جس پر بڑے بڑے حروف میں لکھا ہوا تھا:

"ننّھے دوستوں اول، ٹور اور جون کے لیے، شکریے کے ساتھ۔"

"دیو!" تینوں بچّے ایک ساتھ چلّائے۔ "یہ بُوڑھے دیو کا تحفہ ہے۔"

گھبراہٹ میں اُن کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کریں تو کیا کریں۔ اِتنی بات تو طے تھی کہ اب اُن کی غریبی دُور ہو جائے گی۔ ماں اور تینوں بھائی باقی زندگی آرام سے بسر کریں گے۔ اب ماں کو بچّوں کا پیٹ پالنے کے لیے دن رات محنت نہیں کرنی پڑے گی۔ اس کے بعد وہ سب ہنسی خوشی رہنے لگے۔ کبھی کبھی گرمیوں کے موسم میں اُن کا دوست بوڑھا دیو شام کے وقت اُن سے ملنے آجاتا۔ گھر کے اندر تو وہ داخل ہو نہیں سکتا تھا، کیوں کہ بہت بڑا تھا۔ اس کی تو ایک ٹانگ ہی دروازے میں نہیں آسکتی تھی۔

وہ گھر کے سامنے کھُلے میدان میں بیٹھ جاتا۔ تینوں بھائی اُس کے گھٹنوں پر بیٹھ کر چہک چہک کر باتیں کرتے۔ دیو کے قہقہے اتنے گرجدار ہوتے تھے کہ دُور درختوں پر بنے ہوئے پرندے پھڑ پھڑا کر اُڑ جاتے۔

بھُوت سے یہ کہانی سُن کے پرل بہت خُوش ہوتا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے گہرے دوست بن گئے اور ہمیشہ اکٹھے رہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے وہ آج بھی ناروے کی ایک خُوب صُورت وادی میں رہتے ہیں اور سردیوں میں دُور دُور تک

پھیلی ہوئی رُوئی جیسی سفید اور نرم برف پر پھسلتے ہیں۔ اگر آپ کبھی ناروے کی اِس وادی میں جائیں تو شاید آپ سے ان دونوں دوستوں کی ملاقات ہو جائے۔ پھر کتنا مزا آئے، آئے نا؟

جل دیو

ناروے کے جنگلوں اور پہاڑوں میں آپ کو بے شمار جھیلیں اور چشمے ملیں گے۔ بھُوری چٹّانوں، صنُوبر کے درختوں اور چمکتی ہوئی برف کے درمیانی جھیلیں بالکل نگینے کی مانند جڑی ہوئی لگتی ہیں۔ جل دیو انہی جھیلوں میں رہتے ہیں۔

جل دیو کو ناروے کی زبان میں ”نوایک“ کہتے ہیں۔ لیکن ہم تو ایک کو جل دیو ہی کہیں گے۔ جل دیو یعنی پانی کا دیو۔ جل دیو خاموش جھیلوں میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ ان کا جسم بھدّا اور چکنا ہوتا ہے۔ بالکل ایسے جیسے جل پری کا۔ یہ بے حد شرمیلی مخلُوق ہے۔ اس سے عام طور پر رات کے وقت پانی سے باہر آتی ہے۔ مگر اندھیری راتوں میں ہرگز نہیں۔ جب آسمان پر پورا چاند چمکتا ہے اور اِرد گرد کی

ہر چیز چاندنی میں نہائی ہوئی ہوتی ہے تو جل دیو پانی سے باہر آ کر گھنٹوں چاند کی طرف ٹکٹکی باندھے تکتا رہتا ہے۔

مگر یہ یاد رکھیے، وہ خطرناک بھی ہے۔ اس کی خاموشی اور شرمیلے پن پر مت

جایئے۔ وہ نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کہیں ایک خُوب صُورت لڑکی رہتی تھی۔ اس کی آنکھیں ڈُھلے ہوئے آسمان کی مانند نیلی تھیں۔ بال سُنہری گلاب کی طرح اور جلد برف جیسی سفید اور سیب کی طرح ملائم اور چکنی تھی۔ آواز ایسی تھی جیسے ہنس رہی ہو۔ بولتی تو مُنہ سے پھُول جھڑتے۔ چلتی تو یوں لگتا جیسے ہلکی ہلکی ہوا چل رہی ہو۔

ایک دن شام کے وقت وہ گھر لوٹ رہی تھی۔ چلتے چلتے گُنگنا بھی رہی تھی۔ آج کا دن بہت اچھا گزرا تھا۔ سارا دِن پرندے چہچہاتے رہے تھے۔ بیلے میں جنگلی پھولوں کی بلیں پھُولوں کے گچھوں سے لدی ہوئی تھیں اور اُن کی خُوش بُو سے پورا بیلا مہک رہا تھا۔ خاموش جھیل کے کناروں پر اُگی ہوئی لمبی گھاس کو ہوا کا جھونکا زمین کے ساتھ لگا دیتا تو بہت ہی بھلا لگتا۔

جب وہ لڑکی گھر لوٹ رہی تھی تو مغرب میں سُورج اُونچے پہاڑوں کے پیچھے پہاڑوں کو تھا۔ اس وقت جھیل کا پانی پگھلے ہوئے سونے کی مانند نظر آ رہا تھا۔ ہر

طرف سکوت تھا، سکون تھا اور ٹھنڈک تھی۔ اس نظارے نے لڑکی کو دیوانہ کر دیا۔ وہ دوڑی دوڑی جھیل کے کنارے پر آئی تا کہ شفاف پانی سے مُنہ ہاتھ دھو لے۔

مُنہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہوئی تو سُنہری بال کھول کر اُنگلیوں سے کنگھی کرنے

لگی۔ وہ صاف پانی کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتی تھی اور خوش ہوتی تھی۔ گھر جانے سے پہلے اُس نے جھک کر آخری بار جھیل میں جھانکا تو پانی میں اچانک ہلچل مچ گئی۔ اُونچی لہریں اُٹھنے لگیں۔ بڑے بڑے بھنور پڑنے لگے۔ یوں معلُوم ہوا جیسے جھیل کی چھوٹی سی دُنیا میں طوفان آگیا ہو۔ اس سے پہلے کہ وہ چیخے چلّائے یا وہاں سے بھاگ کھڑی ہو، ایک خوف ناک جل دیو نے اُس کو پکڑ کر پانی میں کھینچ لیا اور گھسیٹتا ہوا گہرے پانی میں لے گیا۔ "

اصل میں جل دیو نے لڑکی کو چاند سمجھا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ چاند آسمان سے اُتر کر جھیل کے کنارے بیٹھا ہے۔ چاند کا عاشق جل دیو چاند کے دھوکے میں لڑکی کے نزدیک گیا اور جب قریب سے اُس کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ پھر اس نے فیصلہ کر لیا کہ یہ حسین چہرہ اُسی کے پاس رہے گا۔ وہ ایک جھپاکے کے ساتھ اُچھلا اور لڑکی کو پانی کے اندر لے گیا۔ وہ لڑکی آج تک اُس جھیل سے باہر نہیں آئی۔ جب کبھی کوئی راہ گیر یا مسافر شام ڈھلے جھیل کے قریب سے گُزرتا ہے تو اُسے جھیل کی سطح پر دُھند کا ہیولا سا تیرتا نظر آتا ہے۔ ساتھ ہی کوئی عورت دردناک

آواز میں گاتی سُنائی دیتی ہے۔

اب میں آپ کو آب شاری جل دیو کی کہانی سُناتی ہوں۔ آب شاری جل دیو جھیلوں کے بجائے بڑے بڑے آبشاروں میں رہتا ہے۔ یہ جل دیو اودھم مچانے والا کھلنڈرا ہوتا ہے۔ جھیل میں رہنے والے تو تنہائی پسند اور خاموشی پسند ہوتے ہیں۔ مگر آبشاری جل دیو کا مزاج بالکل اُس کے اُلٹ ہوتا ہے۔ موسم بہار میں جب برف پگھلتی ہے، زیادہ پانی سے دریا بھر جاتے ہیں اور پہاڑی لوگ گھنے جنگلوں سے عمارتی لکڑی کاٹ کاٹ کر دریاؤں میں بہاتے ہیں تا کہ آسانی سے کارخانوں تک پہنچ جائے، اس وقت آبشاری جل دیو کے بڑے مزے ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے لکڑی کے لٹھّے پانی کے ساتھ اُونچی پہاڑیوں سے نیچے ِگرتے ہیں۔ جل دیو ہنستا ہے، ناچتا ہے اور لکڑی کے لٹھّوں کے ساتھ قلابازیاں لگاتا ہے۔ بعض لٹھّوں کو پکڑ کر تڑاخ سے دو ٹکڑے کر دیتا ہے، ایسے جیسے کوئی ماچس کی تیلی توڑ دے۔ وہ کبھی کبھی کٹے ہوئے درختوں کے موٹے موٹے تنوں کو جکڑ کر باندھ دیتا ہے اور اُنہیں دریا میں ایسا پھنساتا ہے کہ بہتی ہوئی لکڑیاں ایک جگہ

جم کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ پھر وہ لوگ جو جنگلوں سے لکڑیاں کاٹ کر کارخانوں تک پہنچانے کا کاروبار کرتے ہیں۔ اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر آبشاروں میں کُود جاتے ہیں اور بندھی ہوئی لکڑیاں کھول دیتے ہیں۔ لکڑیاں پانی کے ساتھ پھر بہنے لگتی ہیں۔

پرانے زمانے میں کسی جگہ ایک آدمی رہتا تھا جو گھوڑوں کو سُدھانے کی وجہ سے پورے ناروے میں مشہور تھا۔ اس کے ہاتھوں میں سرکش سے سرکش گھوڑا نرم پڑ جاتا تھا۔ اُسے کبھی چابک یا چھڑی استعمال نہیں کرنی پڑی۔ یُوں سمجھ لیں کہ وہ گھوڑوں کے ساتھ دوستوں کی طرح پیش آتا اور دوستی ہی دوستی میں اُنہیں سدھاتا تھا۔

ایک دفعہ اس آدمی نے کسی کسان سے ایک بچھیرا خریدا۔ یہ بچھیرا انہایت خُوب صُورت اور پھُرتیلا تھا اور وہ آدمی اسے بیٹے کی طرح چاہتا تھا۔ بچھیرا ابھی اس سے بہت مانُوس ہو گیا تھا۔ جب بچھیرا ایک برس کا ہوا تو بہار کی ایک سُہانی صُبح کو مالک اس کے پاس آیا۔ اُس کے جسم پر ہاتھ پھیرا اور پیار سے تھپک کر کہنے لگا:

”بیٹا، آج میں پہلی بار تمہیں اپنی ہرے رنگ کی نئی گاڑی میں جوتوں گا۔ پھر پتا ہے ہم کہاں جائیں گے؟ جہاں تُم پیدا ہوئے تھے، وہاں۔“

بچھیرا ابھی بچّہ ہی تھا اور اُس نے گاڑی کھینچنا اچھّی طرح نہیں سیکھا تھا پھر بھی مالک جب اُس کو گاڑی میں جوتنے لگا تو وہ خاموش کھڑا رہا۔ نہ ضِد کی، نہ اڑا۔

جس گاڑی میں اُسے جوتا گیا وہ بالکل نئی تھی اور اُسے خوب سجایا گیا تھا۔ جب اُسے گاڑی میں جوت دیا گیا اور وہ اپنے مالک کو لے کر چلا تو اس کے پیر بڑے فخر سے اُٹھ رہے تھے۔ آج وہ اپنے پیارے مالک کے ساتھ باہر گھومنے جا رہا تھا۔ نئی گاڑی، نیا سفر، اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔ وہ سر اُٹھائے چل رہا تھا۔

راستہ جنگل کے ساتھ ساتھ جاتا تھا۔ اس کے ایک طرف اُونچے پہاڑ تھے، دوسری طرف اُونچے اُونچے درخت۔ جنگل اتنا گھنا تھا کہ دن کے وقت رات کا گُمان ہوتا۔ گاڑی اس سُنسان وادی کے خاموش راستے پر بھاگی جا رہی تھی۔

بچھیرا اُدلکی چال چل رہا تھا اور مالک گاڑی کے آگے بیٹھا سیٹی بجا رہا تھا۔ چلتے چلتے آگے ایک پُل آگیا۔ یہ پُل گہری پہاڑی ندی پر بنا ہوا تھا۔ ندی بلندی سے آبشار کی صُورت میں ِگرتی تھی۔ جہاں یہ آبشار گرتا تھا، وہیں یہ پُل تھا۔ یہاں پہنچ کر

گھوڑے کے مالک نے باگیں ذرا کھینچ لیں اور جھاگ اُڑاتے پانی کو دیکھنے کے لیے چال کچھ آہستہ کر دی۔ وہ بپھرے ہوئے پانی کی سفید چادر کو گرتے دیکھ رہا تھا۔ شیشے کی طرح شفّاف ڈھلان پر پانی کے گرنے کا منظر نہایت دِل کش تھا۔

وہ اس نظارے سے لُطف اُٹھا رہا تھا کہ اُسے اچانک آبشاروں میں رہنے والے جل دیو کا خیال آ گیا۔ یہ جل دیو آبشاروں کے پیچھے چھُپ کر عجیب و غریب ساز پر جادُو بھری دُھنیں بجاتے ہیں جن کو سُن کر راہ چلتے مُسافر رُک جاتے ہیں۔ یہ موسیقی اتنی دھیمی ہوتی ہے جیسے بہار کی ہوا دیو دار کے درختوں کو چھُو کر گزرے۔ اتنی میٹھی ہوتی ہے جیسے جنگلی چڑیا کا گیت اور اتنی جادُو بھری جیسے بیتے ہُوئے اچھّے دنوں کی یاد۔ یہ موسیقی اس قدر پاگل کر دینے والی ہوتی ہے کہ بعض لوگ اس کو سُنتے سُنتے اس کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں اور آبشار میں کُود پڑتے ہیں۔

یہ شخص بھی اس دل کش موسیقی کے بارے ہیں سوچ رہا تھا۔ اُسے اِرد گرد کا ہوش نہ تھا۔ اچانک اس کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی باگیں اپنے آپ کھینچ گئیں،

جھٹکا سا لگا اور گھوڑا خوف سے ہنہنا کر اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے نتھنے پھُولے ہوئے تھے اور آنکھیں اُبلی پڑ رہی تھیں، پھر وہ ایک دم آگے کو کُودا اور بگ ٹٹ دوڑنے لگا۔

وہ دوڑتا رہا۔ کسی طرح رُکنے کا نام نہ لیتا تھا۔ راستے میں ایک درخت سڑک پر جھکا ہوا تھا۔ وہ اُس درخت سے ٹکراتا ہوا نکل گیا۔ گاڑی کے پرخچے اُڑ گئے اور گاڑی کا مالک نیچے گِر پڑا۔ وہ کراہتا ہوا اُٹھا اور پُل پر آکر لیٹ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب ہوا کیا؟ بس لیٹا ہوا آسمان کو گھور رہا تھا۔ جسم میں جان نہیں تھی کہ وہاں سے ہل بھی سکے۔ بدن زخموں سے چُور تھا۔ پھر وہ درد سے کراہتا ہُوا آہستہ آہستہ اٹھا اور اپنے آپ کو گھسیٹ کر پُل کے سِرے تک لے گیا تاکہ اچھّی طرح دیکھے کہ کون سی چیز اُس کے گھوڑے کو ڈرا رہی تھی۔ اس نے جا کر دیکھا تو چونک کر رہ گیا۔ وہاں آبشاری دیو مزے سے بیٹھا قہقہے پر قہقہے لگا رہا تھا۔

”ہا۔۔۔ہا! ہا۔۔۔۔ہا! “

یوں لگتا تھا کہ ہنس ہنس کر اس کی پسلیاں ٹوٹ جائیں گی۔

گھوڑے کے مالک نے غصّے سے چیخ کر کہا:

"تو یہ آپ تھے، جس نے میرے غریب گھوڑے کو ڈرایا!"

جل دیو آدمی کے چہرے پر غصّہ دیکھ کر اور زیادہ ہنسنے لگا۔ وہ جتنا غصّہ دکھاتا تھا، جل دیو اُتنا ہی زور سے ہنستا تھا۔ پھر آدمی نے سوچا کہ جل دیو کے ساتھ بک بک جھک جھک کرنا بیکار ہے۔ اب چلنا چاہیے۔ پاؤں اُٹھایا تو من بھر کا تھا۔ ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ دائیں ٹانگ میں خاصا بڑا زخم تھا جس میں سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو کھینچتا ہوا پُل کے دوسرے سِرے پر لے گیا۔ جل دیو کے قہقہے یہاں بھی سُنائی دے رہے تھے۔

کُچھ ہی دیر بعد چند دیہاتی اُدھر سے گُزرے۔ اُنہوں نے جب دیکھا کہ پُل کے پاس ایک آدمی زخمی حالت میں پڑا ہے تو جا کر سٹریچر اُٹھا لائے۔ آدمی کو اس پر لٹایا بھاگے ہوئے گھوڑے کو بھی قابو میں کیا۔ پھر آدمی کو گاؤں لے چلے تا کہ مرہم پٹی کریں۔ آدمی نے اُن کو اپنی کہانی سُنائی تو وہ بھاگ کر پُل پر پُہنچے تا کہ

آبشاری دیو کو دیکھیں، لیکن وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ جل دیو کہیں غائب ہو چکا تھا۔
لیکن جب وہ زخمی آدمی کو اُٹھائے گاؤں طرف جا رہے تھے تو اُنہیں بھی اپنے
پیچھے قہقہے سُنائی دیے جو آبشار کی بُلندی سے آ رہے تھے۔ جل دیو کہیں چھُپا بیٹھا
تھا اور زور زور سے ہنس رہا تھا:

"ہا۔۔۔ہا!ہا۔۔۔۔ہا!"

چند سال بعد بچھیرا بڑا ہو کر گھوڑا بن گیا۔ اب وہ اپنے مالک کے اشارے پر چلتا
تھا۔ لیکن مالک نے اُسے پُل کی طرف لے جانے کی کبھی جرأت نہ کی۔

چھلاوا

ناروے کی زبان میں چھلاوے کو "نسنی" کہتے ہیں۔ اب میں جو کہانی سُنانے لگی ہوں، وہ چھلاووں ہی کی ہے۔ چھلاوے ہر ملک میں ہوتے ہیں۔ لیکن یہ کہانی ناروے کے چھلاووں کی ہے۔ چھلاوے بونوں کے خاندان سے ہیں۔ قد وہی دو تین فٹ جو اکثر بونوں کا ہوتا ہے۔ یہ آج تک معلوم نہ ہو سکا جبکہ چھلاوے اپنا بچپن کہاں گزارتے ہیں اور جوانی میں کہاں رہتے ہیں۔ کیوں کہ اِن کو جب بھی دیکھا، بُوڑھے ہی نظر آئے۔ سفید لمبی داڑھی پیٹ کو چھوتی ہوئی۔ لال رنگ کی لمبی ٹوپی جس کی نوک دار دُم میں گھنگھرو یا پھندنا ٹنکا ہوا ہوتا ہے اور ذرا سی حرکت سے جھولنے لگتا ہے۔

چھلاوا کسانوں کے کام میں خوب ہاتھ بٹاتا ہے۔ اس لیے کسان اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے ہیں۔ اگر کوئی کسان چاہتا ہے کہ اس کی فصل اچھّی ہو، اس کے مویشی تن درُست رہیں، گائیں زیادہ دُودھ دیں اور مُرغیاں موٹے انڈے دیں تو وہ اپنے کھیت کے آس پاس رہنے والے چھلاوے کا خاص خیال رکھتا ہے، کیوں کہ اگر کسان ہونے چھلاوے کا دوست ہو گا تو اس کے سارے کام چھلاوا کر دے گا۔ جانوروں کو بھُوک لگی ہو تو اُنہیں چارہ کھلا دیتا ہے۔ بیمار پڑ جائیں تو ان کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ کھیت میں ہل چلانے کی ضرورت ہو تو رات کے پچھلے پہر ہل چلا کر زمین ہموار کر دیتا ہے۔

کسان کی نوکرانیاں جب کبھی چارے والے کمرے میں چارہ لینے جاتی ہیں تو بھُوسے کے ڈھیر کے پیچھے سے دو چمک دار آنکھیں جھانکتی ہیں یا ایک سایہ سا نکل کر باہر کے دروازے کی طرف بھاگتا دکھائی دیتا ہے۔ کبھی یہ سایہ لکڑیوں کے ڈھیر کے پیچھے گم ہو جاتا ہے اور کبھی سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ چھلاوا بڑا شریر ہوتا ہے اور اپنی شرارتوں سے لوگوں کو حیران کرتا رہتا ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے، کسی بہت بڑے زمین دار کے گھر دو نوکرانیاں کام کرتی تھیں۔ رات کا کھانا کھلا کر اُنھوں نے برتن دھوئے اور سوکھنے کے لیے باروچی خانے کی میز پر رکھ دیے اور خود سونے کے کمرے میں چلی گئیں۔ سونے کا کمرا باورچی خانے کے برابر ہی تھا۔ ابھی وہ بستر میں لیٹی ہی تھیں کہ باورچی خانے میں زبردست شور ہوا۔ اُنھیں ایسے لگا جیسے کسی نے ساری پرچیں پیالیاں اور پلیٹیں میز پر سے اُٹھا کر فرش پر دے ماری ہوں۔ وہ ڈر گئیں، اُنھیں باورچی خانے میں جا کر حقیقت معلوم کرنے کی ہمّت نہیں پر رہی تھی۔ ایک کہتی تھی تم جاؤ، دوسری کہتی تھی تم جاؤ۔ آخر ایک نوکرانی نے حوصلہ کر کے سونے کے کمرے میں کھُلنے والا باورچی خانے کا دروازہ کھولا اور دبے پاؤں اندر گئی تاکہ معلوم کرے کہ معاملہ کیا ہے۔

دروازہ کھولتے ہی نوکرانی نے دیکھا کہ باورچی خانے کی بڑی میز کے عین درمیان میں ایک چھلاوا کھڑا ہے اور چینی کے سارے برتن فرش پر ڈھیر ہیں۔ چھلاوے نے نوکرانی کا سہما ہوا چہرہ دیکھا تو کِھل کھلا کر ہنسا۔ وہ اتنے زور سے قہقہے لگا رہا تھا

کہ اُس کی پسلیاں ٹوٹ گئی ہوں گی۔ جب وہ ہنستے ہنستے دوہرا ہوا تو اُس کی لال ٹوپی کا پھُندنا میز کو چھُوتا تھا۔ بڑی مُشکل سے ہنسی کا دورہ ختم ہوا تو وہ کھڑکی کے راستے غائب ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد بے چاری نوکرانی جلدی جلدی برتن سمیٹنے لگی۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ کوئی پرچ، پیالی یا پلیٹ نہیں ٹوٹی۔ سب ٹھیک ٹھاک تھیں۔

اس واقعے کے چند دن بعد زمیندار نے اپنے بیٹے کو اصطبل میں گھوڑوں کو گھاس ڈالنے کے لیے بھیجا۔ سردیوں کی رات تھی اور بے حد اندھیرا تھا۔ جوں ہی وہ گھاس اُٹھانے لگا تو دو چمک دار آنکھیں گھورتی ہوئی سی نظر آئیں۔

"یہ وہی کُتّا ہے۔ کم بخت کو کتنا منع کیا کہ اصطبل میں نہ آیا کر، لیکن باز ہی نہیں آتا۔"

لڑکے نے سوچا اور پھر گھوڑوں کے آگے گھاس ڈالی اور ایک چھوٹی سی چھڑی سے کتّے کو گھاس کے ڈھیر میں سے نکالنے لگا۔ "ہٹ۔۔۔ ہٹ۔۔۔ چل یہاں سے۔" مگر وہاں کتّا ہوتا تو نِکلتا۔ وہ بے کار اِدھر اُدھر چھڑی مارتا پھرا۔ پھر خود کو

سمجھاتے ہوئے بولا:

”ہوں! میرا خیال ہے، بھاگ گیا۔“

جب وہ گھر جانے کے لیے باہر نِکلا اور چارے والے اِحاطے کے پاس پُہنچا تو ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی اُس کی ٹانگوں میں پھنس گئی اور وہ چاروں شانے چِت زمین پر گر گیا۔ وہ کھڑا ہو کر کپڑے جھاڑ رہا تھا اور غصّے سے اُس کا خون کھول رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ احاطے کے دروازے پر بیٹھا ہوا چھلاوا زور زور سے ہنس رہا ہے۔ یوں لگتا تھا کہ اُس کی لال ٹوپی اب گِری کہ گِری۔

چھلاوے کو ایک چیز بے حد پسند ہے اور وہ ہے کرسمس کی کھیر۔ کرسمس کی کھیر چھلاوے کو تو بنانی آتی نہیں، اس لیے کسان کی بیوی کرسمس کے موقع پر خاص طور سے چھلاوے کے لیے تیّار کرتی ہے۔ کرسمس سے پہلے کی رات نوکرانی کھیر سے بھرا ہوا پیالہ لے کر چارے کے کوٹھے میں رکھ آتی ہے۔ کرسمس کی کھیر آلو بخارے یا سیب کی عام کھیر نہیں ہوتی، بلکہ ملائی کی طرح ہوتی ہے۔ اس میں دار چینی، کھوپرا، بادام، پستہ، کشمش اور چینی ملی ہوتی ہے۔ اس کے اوپر چھوٹا سا میٹھا کیک رکھا ہوتا ہے۔ تو جناب کسان کی بیوی چھلاوے کو خوش کرنے کے لیے ایسی مزیدار کھیر تیّار کرتی ہے۔ اگر کبھی کسان کی بیوی کرسمس کی کھیر دینا بھُول

جائے تو چھلاورے کو بڑا غصّہ آتا ہے اور وہ کسان کے سارے جانوروں کو بیمار کر دیتا ہے۔ سارا سال کسان کے کام بگڑتے رہتے ہیں۔ کبھی کوئی بیمار ہو جاتا ہے، کبھی فصل نہیں ہوتی۔ غرض بے چارہ کسان سال بھر تکلیفیں اٹھاتا رہتا ہے۔

مشہور ہے کہ کسی جگہ ایک کسان رہتا تھا۔ اُس کے پاس بڑی اچھّی زمین تھی۔ جانور تندرست تھے۔ گائیں کافی دُودھ دیتی تھیں۔ صحت مند اور طاقت ور گھوڑے تھے جن کی کھال ایسی چکنی اور چمک دار تھی جیسے اُنھوں نے کوٹ پہن رکھے ہوں۔ روپیہ پیسہ بھی کافی تھا۔ غرض کسان کے پاس کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ وہ بڑی بے فکری کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ بیوی ہر وقت مُسکرانے اور خوش رہنے والی عورت تھی۔ بچّے صحت مند اور ہر وقت ہنستے رہتے۔

ایک دِن کسان نے سوچا کہ اس جگہ کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جانا چاہیے۔ ایک ہی جگہ رہتے رہتے وہ اُکتا گیا تھا۔ یہ سوچ کر اُس نے گھر اور کھیت بیچ دیے۔ یہاں ایک نیا کسان آ گیا۔ اس کھیت میں جو چھلاوا رہتا تھا وہ پہلے کسان سے پیار کرنے لگا تھا اس لیے نئے مالک کے آنے پر چھلاوے کو بڑی اُلجھن ہو رہی تھی۔ وہ معلُوم

کرنا چاہتا تھا کہ نیا مالک کس قسم کا ہے۔

جب شام ہوئی تو چھلاوا کسان کے گھر میں گھُس گیا۔ کسان اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا:

"وہ کسان جو یہاں سے گیا ہے، کہتا تھا کہ اس گھر میں چھلاوا رہتا ہے۔ اس کا خاص

خیال رکھنا۔ ہی ہی۔ میں نے آج تک ایسی احمقانہ بات نہیں سُنی۔ بے چارہ وہمی آدمی تھا۔ بھلا چھلاوا بھی کوئی چیز ہے۔ خواہ مخواہ کا وہم۔"

کسان کی یہ بات سُن کر چھلاوے کو بڑی حیرت ہوئی۔

اس کے بعد کسان جب کبھی چارے والے کمرے میں جاتا تو زور زور سے کہتا:

"شو۔۔۔ شو۔۔۔ چل دُور ہو بلّی۔" یا کہتا۔ "کتّے کے بچّے، نِکل یہاں سے۔"

یہ سُن کر چھلاوے کو بڑا تاؤ آتا۔ آخر اُس نے فیصلہ کیا کہ اِس شکّی مزاج آدمی کو ایک دن خوب مزا چکھاؤں گا۔ اس نے سمجھا کیا ہے۔

کِرسمَس میں ایک ہی ہفتہ رہتا تھا۔ کسان ایک شام چارے والے احاطے میں چارہ لینے گیا۔ وہ ہر روز وہاں جاتا تھا۔ کوئی نئ بات نہیں تھی۔ جوں ہی وہ چارے کا گٹھّا باندھنے کے لیے جھکا، کِسی نے اس کی گردن پر زور سے گھُونسا مارا۔ کسان نے اِرد گِرد نِگاہ دوڑائی۔ کُچھ نظر نہ آیا۔ پھر جھکا۔ پھر زور کا تھپّڑ پڑا۔ وُہ پھر رُک گیا۔ اب کے کسی نے کمر میں کوئی چیز دے ماری۔ پھر اس کے مُنہ، سر، کمر، ہاتھ،

پاؤں، ٹانگوں، غرض پورے جسم پر جوتے برسنے لگے۔ وہ درد کے مارے ہائے ہائے کرتا کُودتا پھر رہا تھا۔مکّوں سے بچنے کے لیے کبھی اِدھر دوڑتا، کبھی اُدھر۔ لیکن مارنے والا نظر نہ آتا تھا۔ اچانک اُس کی نظر ایک سفید داڑھی والے بونے پر پڑی جو ہاتھ میں چھڑی لیے کھڑا تھا۔ چھلاوا تھا تو قد میں چھوٹا سا مگر مارتا اتنے زور سے تھا کہ کسان بلبلا تا اُٹھتا تھا۔

"ہائے میں مرا، ہائے میں مرا!"

کسان کو بھاگنے کے لیے راستہ نہیں مل رہا تھا اور چھلاوا چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا:

"آؤ، تُمھیں چھلاوے سے ملائیں۔ آؤ نا، تُمھاری ملاقات چھلاوے سے کراؤں۔۔۔احمق کہیں کے۔"

حب چھلاوا کسان کو خوب مار پیٹ چُکا تو کہیں جا کر چھُپ گیا۔ کسان کا سارا جسم درد کر رہا تھا۔ اس سے سیدھا نہ چلا جاتا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے لنگڑاتا ہوا گھر گیا اور کئی دن تک بستر میں پڑا رہا۔

چھلاوے کو یقین تھا کہ اب کسان مان لے گا کہ اس کے گھر میں کوئی چھلاوا رہتا ہے۔ کرسمس کے دن نزدیک آ رہے تھے۔ چھلاوے کو ضرور اس کا حصّہ ملے گا۔ کرسمس کی کھیر کو یاد کر کے اُس کے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ اب وہ کرسمس کے آنے کے دِن گِننے لگا۔

کرسمس سے ایک دن پہلے چھلاوا بھاگا بھاگا چارے والے کوٹھے میں گیا۔ اس کا خیال تھا کہ کھیر رکھی ہوئی ہو گی۔ مزے سے کھاؤں گا، لیکن افسوس کرسمس کی کھیر اُسے کہیں نظر نہ آئی۔ گھر والوں نے اُس کا حصّہ نِکالا ہی نہیں تھا۔ چھلاوا مکان کے روشن دان پر چڑھ گیا۔ وہاں سے اندر جھانکنے لگا۔ بڑے کمرے میں کرسمس کی بڑی بڑی موم بتّیاں جل رہی تھیں۔ خوب روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ میز کے گرد بیٹھے کھا پی رہے تھے۔ میز قسم قسم کے کھانوں سے بھری ہوئی تھی۔ بڑے سے پیالے میں سُنہری رنگ کی کرسمس کی کھیر پڑی ہوئی تھی جس میں سے گرم گرم بھاپ اُڑ رہی تھی۔ کسی کو بھی چھلاوے کا خیال نہ تھا۔ کوئی بھی اس کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا۔

کرسمس کے بعد جو سال شروع ہوا تو نے کسان کی ساری کھیتی باڑی تباہ و برباد ہو گئی۔ کھیتوں میں کھڑی فصلیں سُوکھ گئیں۔ گھاس سِرے سے پیدا ہی نہیں ہوئی۔ گھوڑے سوکھ کر کانٹا ہو گئے۔ گائیں یا تو بیمار رہتیں یا اِتنا کم اور پتلا دُودھ دیتیں کہ گزارہ ہی نہ ہوتا۔ جو روپیہ اُن کے پاس جمع تھا، چوری ہو گیا۔ یوں سمجھ لیجیے کہ ہر طرف سے مصیبتوں نے گھیر لیا۔ جس چیز میں بھی ہاتھ ڈالتا تھا، مٹّی ہو جاتی تھی۔ بہت پریشان ہوا۔ کرے تو کیا کرے! آخر سوچ سوچ کر زمین کے پہلے مالک کو خط لکھا:

"بھیّا، میرے ساتھ تو بہت بُری ہوئی۔ تُم ہی کُچھ مدد کرو۔ میں مر گیا، برباد ہو گیا۔"

پہلے کسان نے اُس کو خط لکھ کر پوچھا۔ "کیا تُم چھلاوے کا اچھّی طرح خیال رکھتے ہو؟ کہیں اُسے کوئی تکلیف تو نہیں پہنچائی؟"

اب تو نئے کسان کی حیرت کی حد نہ رہی۔ اس نے سوچا کہ اوہو! چارے والے کوٹھے میں لال ٹوپی اور سفید داڑھی والا بُوڑھا چھلاوا ہی ہو گا جس نے مُجھے مار مار

کر ادھ مُوا کر دیا تھا۔ ٹھیک۔ اب میں اُس سے ملاقات کروں گا۔

جُوں تُوں کر کے سال گزر گیا۔ جب دوبارہ کرسمس آیا تو کسان نے اپنی بیوی سے

کہا کہ کھوپرا، پستہ بادام، کشمش، دار چینی اور چینی ملا کہ ان کی کھیر تیّار کرو۔ پھر اس کو بڑے پیالے میں بھر دو۔ اس پر میٹھا کیک رکھنا مت بھولنا۔ بیوی نے ساری چیزیں ڈال کر کھیر تیّار کی تو کسان خود لے کر چارے والے کوٹھے میں گیا۔ میز پر صاف سُتھری سفید چادر بچھائی اور کھیر کا پیالہ اُس پر رکھ دیا تا کہ چھلاوہ خوش ہو کر کھائے۔

وہ دن اور آج کا دن، نیا کسان چھلاوے کو خوش رکھنے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ اب اُس کے کھیت خُوب فصل دیتے ہیں۔ مویشی بھلے چنگے اور تندرست رہتے ہیں۔ اس کا کھیت پوری وادی میں سب سے اچھّا کھیت ہے۔ سب کنُبہ خوش اور چھلاوا تو خوش ہے ہی۔ اس لیے کہ سال کے سال کرسمس پر اُسے ملائی کی کھیر سے بھرا ہوا پیالا ملتا ہے۔

سمندری بھُوت

سمندری بھُوت بھی جل دیو کا رشتے دار ہی ہے۔ فرق یہ ہے کہ سمندری بھُوت سمندروں میں رہتا ہے۔ سمندر میں رہنے والی جل پریوں سے اُس کی رشتے داری ہے۔ سمندری بھُوت جل دیو کی طرح بہت بڑا نہیں ہوتا۔ اس کے سر سے پیر تک سمندری گھاس اور جڑی بوٹیاں اُگی ہوئی ہوتی ہیں۔ گھونگے، سیپیاں اور سمندر کی تہہ میں پائے جانے والے رنگین پتھّر اُس کے جسم پر لگے ہوتے ہیں۔ جب سمندر میں ٹھہراؤ ہو، لہریں آہستہ آہستہ اُٹھ رہی ہوں تو شام کے وقت سمندری بھُوت مچھیروں کے گاؤں کے باہر کھڑی کشتیوں میں آ بیٹھتا ہے۔ سمندری بھُوت عام طور پر اسی وقت آتا ہے کیوں کہ اُس وقت مچھیرے دِن

بھر شکار کرنے کے بعد گاؤں کے باہر مچھلیوں کا ڈھیر لگا دیتے ہیں اور ان میں سے اچھّی ایک طرف اور گندی دوسری طرف رکھتے جاتے ہیں۔ بعض اِطمینان سے اپنا جال مرمّت کر رہے ہوتے ہیں۔ مچھیروں کا دھیان اپنے کام کی طرف ہوتا ہے تو سمندری بھُوت چُپکے سے آکر کِسی کشتی میں چھُپ جاتا ہے، یہ بھُوت کبھی کبھی کھُلے سمندروں سے نِکل کر خلیجوں اور کھائیوں میں آجاتا ہے۔ جہاں تک جا سکتا ہے، چلا جاتا ہے۔ ورنہ عام طور پر کھُلے سمندروں ہی میں رہتا ہے۔ اس کو بھی انسانوں کو ستانے اور اُن کا مذاق اُڑانے میں مزا آتا ہے۔ اپنی ہوشیاری اور چالاکی سے انسانوں کو بہکا کر گہرے سمندر میں لے جاتا ہے، وہ غریب وہاں جا کر بھٹک جاتے ہیں۔

جب کہیں سمندری بھُوت نظر آئے تو سمجھ لیجیے کہ اگلے روز یارات ہی کو سمندر میں طوفان آئے گا۔ سمندری بھُوت زیادہ تر اس وقت نظر آتا ہے جب سمندر پر گہری خاموشی چھائی ہوئی ہو۔ ہوا بالکل تھم چکی ہو۔ ایسی ٹھہری ہوئی شام میں بھُوت پانی سے باہر نِکلتا ہے۔ بعض اوقات طوفان کے دوران بھی نمودار ہوتا

ہے، جب سمندر میں دُور دُور تک سفید جھاگ ہی جھاگ ہوتا ہے اور تیز ہوا لہروں کو دھکیل کر دُور دُور لے جاتی ہے۔ ایسے طوفان میں مچھیرے اپنے بادبان اُٹھا دیتے ہیں اور ایک چھوٹا سا پردہ رہنے دیتے ہیں جس سے کشتی کا توازن قائم رہے۔ پھر کشتی کو ہوا کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسے وقت میں اگر کِسی مچھیرے کی مُڈ بھیڑ کسی سمندری بھُوت سے ہو جائے تو کشتی کے تباہ ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔

ایسے موقعوں پر سمندری بھُوت کشتی میں سوار ہو کر آتا ہے، یہ کشتی سالم نہیں ہوتی۔ آدھی اور دُم کٹی ہوتی ہے۔ بھُوت اپنی کشتی کو ہوا کے مُخالف کھے کر لاتا ہے۔ کشتی کی رفتار طُوفان سے بھی زیادہ تیز ہوتی ہے۔ وہ پہاڑ جتنی اُونچی لہروں کی پروا کیے بغیر بڑھا چلا آتا ہے۔ طوفان میں پھنسے ہوئے مچھیرے کا مُنہ چڑاتا ہے۔ اس پر زور زور سے ہنستا ہے۔ اس کی ہنسی سے پانی میں بڑے بڑے بھنور پڑتے ہیں۔ بے چارہ مچھیرا بچاؤ کے لیے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارتا ہے لیکن وہ طوفان سے نکلنے کی جِتنی کوشش کرتا ہے، بھُوت اُسے گھیرنے کی اُس سے زیادہ

کوشش کرتا ہے۔ اگر مچھیرا کشتی کو اپنے قابو میں کر لے تو سمندری بھُوت غائب ہو جاتا ہے۔ اُدھر مچھیرا طوفان سے باہر نکلا، اُدھر سمندری بھُوت چھُپا۔

پچھلے زمانے میں مچھیرے اپنی کشتیوں کو سمندری بھُوت سے بچانے کے لیے کشتی کے پیندے ہیں صلیب لگایا کرتے تھے۔ یا اس کے اگلے حصّے پر صلیب کی تصویر بنا دیا کرتے تھے۔ راتوں کو صلیب میں آگ لگا کر کشتی کے سامنے گاڑ دیتے تا کہ اندھیرے میں دُور دُور تک نظر آئے۔ صلیب کی وجہ سے اُن کی کشتیاں جِن بھُوتوں سے محفوظ رہتی تھیں۔

کسی زمانے میں ناروے کے مغرب میں سمندر کے کنارے ایک گاؤں میں ایک مچھیرا رہتا تھا۔ یہ مچھیرا کشتیاں بہت اچھّی بناتا تھا۔ اس کی کاری گری کی شہرت ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ دُور دُور سے اس سے کشتیاں بنوانے آتے تھے۔ ایک دن اُس نے اپنے لیے ایک ایسی کشتی بنانے کا ارادہ کیا جسے دیکھ کر لوگ دنگ رہ جائیں۔ مچھیرے کو کئی ہفتے دِن رات محنت کرنی پڑی۔ جب کشتی مکمّل

ہوئی تو وہ سچ مُچ نہایت خُوب صُورت تھی۔ جو بھی دیکھتا، عش عش کر اٹھتا۔ بعض حسد بھی کرنے لگے، اور بعض نے کشتی خریدنے کے لیے بڑی بڑی رقمیں پیش کیں لیکن مچھیرے نے صاف انکار کر دیا۔ وہ اِتنی محنت سے بنائی ہوئی کشتی کو بیچنا نہ چاہتا تھا۔

ایک روز گاؤں کا پادری مچھیرے کے پاس آیا اور بولا کہ مُجھے برابر والے جزیرے میں وعظ کہنے جانا ہے۔ اپنی کشتی میں بٹھا کر چھوڑ آؤ۔ جزیرہ چند میل کے فاصلے پر تھا۔ مچھیر افوراً رضامند ہو گیا۔۔

اُسے اس بات پر فخر تھا کہ اس کی نئ خُوب صُورت کشتی میں گاؤں کا پادری بیٹھے گا اس وقت دن ڈھلنے والا تھا۔ مچھیرے نے سوچا جلدی سے پادری کو چھوڑ کر شام ہونے سے پہلے واپس آ جاؤں گا۔ دونوں کشتی میں بیٹھ گئے۔ مچھیرے نے تیزی سے کشتی چلائی اور پادری کو جزیرے میں پہنچا دیا۔ جب واپس آنے لگا تو پادری نے منع کیا۔

”رات ہونے والی ہے۔ اس وقت مت جاؤ۔ کل صُبح چلے جانا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہیں، لگتا ہے طوفان آئے گا۔“

مگر مچھیرے نے ایک نہ مانی اور اسی وقت کشتی موڑ کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہ ابھی زیادہ دُور نہیں گیا تھا کہ آسمان پر بادل اور زیادہ گہرے ہو گئے۔ تیز ہوا چلنے لگی۔ پھر ہوا آندھی میں بدل گئی۔ مچھیرے نے بادبان سمیٹ لیے۔ وہ ایک تجربہ کار مچھیرا تھا۔ گھبرایا نہیں، کشتی نئ اور مضبوط تھی۔ اُسے اپنی کشتی پر پورا بھروسا تھا۔

سمندر کی لہریں اُونچی اُٹھنے لگیں۔ کشتی پانی پر ہچکولے کھانے لگی۔ ہوا کا زور اُسے

پَر کی

طرح اُڑا رہا تھا۔ مچھیرا کشتی کو قابو میں رکھنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ آخر کُچھ دیر بعد لہروں اور بھنور میں سے کشتی کو باہر نکال لایا۔

اچانک طوفان کی گونج اور ہوا کے شور سے بلند ایک چیخ اُسے سُنائی دی۔ یہ چیخ تیز اور عجیب و غریب تھی۔ وہ جھاگ اُڑاتی ہوئی لہر کو چیرتا آگے نکل گیا۔ یکایک اُس کو سامنے سے ایک خوف ناک چیز آتی دکھائی دی۔ یہ چیز اُسی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ قریب اور قریب۔ ہائے یہ تو سمندری بھُوت تھا۔ مچھیرے نے فوراً پہچان لیا۔ یہ گونگی بہری مخلوق برابر اُسی کو گھور رہی تھی۔ کیا مجال جو آنکھ بھی جھپکے۔

مچھیرا ایک طرف خوف سے لڑ رہا تھا اور دوسری طرف تیز ہوا اور طوفانی لہروں سے۔ اُسے ایک دم خیال آیا کہ اُس نے اپنی کشتی کے سامنے صلیب لگائی ہی نہیں، اور نہ صلیب جلا کر کشتی کو دھونی دی ہے۔ یہ سوچ کر اُس کی رگوں میں خون جم گیا۔ وہ دل ہی دل میں دعائیں کرتا، تھر تھر کانپتا، کشتی چلانے لگا۔ وہ جلد

سے جلد ساحل تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔

ابھی چند ہی لمحے گزرے تھے کہ سمندری بھُوت پھر آ گیا۔ اس دفعہ اُس کی رفتار پہلے سے کئی گنا تیز تھی۔ وہ قہقہے لگاتا تیر کی طرح سیدھا مچھیرے کی کشتی کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ ڈبکی لگا گیا۔ غریب مچھیرے کو اندازہ ہوا کہ اُس کی زندگی کی آخری گھڑی آ پہنچی ہے۔ وہ سر جھکا کر خُدا کو یاد کرنے لگا۔

اچانک اُسے کشتی کے فرش پر کوئی چیز چمکتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ جھکا اور وہ چیز اُٹھا لی۔ یہ سونے کی صلیب تھی اور شاید اُس پادری کی تھی جسے مچھیرا دوسرے جزیرے میں چھوڑ کر آرہا تھا۔ مچھیرے کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔

وہ اُسے غور سے دیکھ رہا تھا کہ کہ پھر بھُوت کی چیخ سُنائی دی۔ اب کے وہ خوشی کا

اظہار کر رہا تھا، جیسے اُسے اپنے شکار کو حاصل کر لینے کا پورا یقین ہو۔ وہ سامنے سے حملہ کرنا چاہتا تھا۔ مچھیرا کشتی میں چُپ چاپ کھڑا تھا اور اپنے دُشمن کی طرف مُنہ کیے اُسے سونے کی صلیب دکھا رہا تھا۔ اُس وقت بچاؤ کی یہی ایک صورت تھی۔

بھُوت نے صلیب کو سامنے لہراتے دیکھا تو غصّے، نفرت اور مایوسی سے چیختا چلّاتا سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ ایسا غائب ہوا کہ پھر نظر نہ آیا۔

سمندر کی لہریں اُونچی اُونچی اُٹھنے لگیں۔ آسمان پر زور سے بادل گرجا اور بجلی کڑکی۔

اس رات کوئی معجزہ ہی مچھیرے کو حفاظت کے ساتھ ساحل پر پُہنچا سکتا تھا، ورنہ کوئی صُورت نظر نہ آتی تھی۔ مگر وُہ خُدا پر بھروسا کیے کشتی کھیتا رہا۔

آخر طوفان کُچھ کم ہوا اور جب مچھیرا ساحل پر پُہنچا تو طوفان بالکل تھم چُکا تھا۔ بادل چھَٹ گئے تھے۔ مَطلع صاف ہو چکا تھا۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے چل رہے

تھے۔

گھر پہنچ کر مچھیرے نے پہلا کام یہ کیا کہ لکڑی کی ایک بڑی سی صلیب بنائی اور کشتی کے پیندے میں گاڑ دی۔ اس کے بعد وہ جو کشتی بناتا اُس کے پیندے میں صلیب گاڑنا نہ بھولتا، یا کشتی کے اگلے حصّے پر صلیب کی تصویر بنا دیتا۔ اب کوئی بھُوت اُس کی بنائی ہوئی کشتی کو تباہ کرنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔